رجسٹر نمبر ایل ۵۳۳۰

جلد ۵۲ عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور، پاکستان

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

خالی صفحه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۲	بابت ماہ مئی ۱۹۵۹ء	جلد ۵۲

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن

اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اِشارات

زوال اپنے مزاج کے اعتبار سے بڑا ہمہ گیر اور کلیت پسند واقع ہوا ہے۔ یہ جب کسی قوم پر آتا ہے تو اس کی پوری زندگی تہ و بالا کر دیتا ہے۔ اُس کی حیات کا کوئی گوشہ اور اُس کے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ پھر ایسا نہیں رہتا جس پر اس کی منحوس پرچھائیں نہ پڑتی ہوں مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس زوال کی پہلی زد ہمیشہ کسی قوم کے سوچنے کے انداز اور غور و فکر کے طور طریقوں پر پڑتی ہے۔ سب سے پہلے فکر و نظر اور احساس و وجدان کی چولیں ہی ہلتی ہیں بعد اس کے بعد اس قوم کی معاشرت، سیاست اور معیشت میں، جو دراصل اس کے قلب و نگاہ کے ہی خارجی مظاہر ہیں، ایک زبردست بگاڑ رونما ہونا شروع ہوتا ہے۔

قدرت کے اس ضابطے کا اگرچہ انسانوں کا ہر گروہ کسی حد تک پابند ہے مگر وہ قوم اس کی زیادہ تابع ہے جو انسان کے افکار و نظریات کو مادی ماحول کا عکس نہیں سمجھتی۔ بلکہ اجتماعی ماحول کو انسانوں کی داخلی کیفیات کا شارح اور ترجمان خیال کرتی ہے۔ اس قوم کے نزدیک فکر و نظر کی تبدیلی موت کے مترادف ہے خواہ اُس کی خارجی زندگی میں اس کے اثرات کچھ بہت نمایاں نہ ہوں۔

پھر امتِ مُسلمہ کا معاملہ تو اس لحاظ سے اور بھی نازک ہے۔ اس امت کو بلاشبہ کہا تو یہی گیا ہے کہ تم اس کارگہِ حیات میں ایک غیر متعلق تماشائی بن کر نہ رہو بلکہ اجتماعی زندگی کے عین منجدھار میں رہتے ہوئے حق اور صداقت کی گواہی دو لیکن اس کے لیے اصل اور

حقیقی زندگی صرف آخرت ہی قرار دی گئی ہے۔ دنیا کی اس امتحان گاہ میں جو اچھے اعمال لوگوں سے سرزد ہوتے ہیں وہ اس کی فلاح و کامرانی کا ذریعہ تو بن سکتے ہیں مگر وہ بجائے خود فلاح و کامرانی نہیں کہلائے جا سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی کامیابی کا مدار ظاہری اعمال پر نہیں بلکہ اُس نیت پر ہے جو ان کے پسِ پردہ کام کرتی ہے اور چونکہ نیت ایک ایسی لطیف اور غیر مرئی شے ہے جسے نہ تو کوئی ترازو خواہ وہ کتنا ہی حساس ہو، تول سکتا ہے، نہ کوئی خورد بین خواہ کتنی ہی طاقتور ہو، دیکھ سکتی ہے، نہ کوئی پیمانہ خواہ کتنا ہی صحیح ہو، اس کی پیمائش کر سکتا ہے۔ اس لیے دنیا کی کوئی عدالت خواہ وہ کتنی ہی بے لاگ کیوں نہ ہو، نیت پر کوئی حکم نہیں لگا سکتی۔ اس کی جزا تو وہی علیم و خبیر ذات دے سکتی ہے جس کی نگاہ سے کوئی کھلی اور چھپی چیز اوجھل نہیں رہ سکتی۔ جس کی نظر بیک وقت ظاہری اعمال اور قلبی واردات پر پڑتی ہے۔ لہٰذا ایک مسلم کے لیے کامیابی کا معیار سلطنت کی توسیع، سڑکوں اور ہسپتالوں کی تعمیر، زر و مال کی فراوانی نہیں بلکہ اُس دن کی سرخروئی ہے جس کا نقشہ قرآنِ حکیم نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کھینچا ہے:

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝
وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ
الْإِنسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ
أَخْبَارَهَا ۝ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ
يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝
فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝
وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝

(سورۂ زلزال)

جب زمین اپنی سخت جنبش سے خوب ہی ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے بوجھ باہر پھینک نکالے گی اور آدمی بول اٹھے گا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ اُس دن زمین اپنی سب خبریں بیان کر گزرے گی، اس لیے کہ پروردگار کا حکم اسے یہی ہو گا۔ اس دن لوگ جدا جدا نکلیں گے تا کہ ان کے اعمال انہیں دکھائے جائیں۔ پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہو گی وہ اس کو دیکھے گا۔

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اُس کا کہیں یہ مطلب نہ سمجھ لیا جائے کہ ہمارے نزدیک دنیا اور اس کے مسائل کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ نہیں ہماری اس گزارش کا یہ مدعا ہرگز نہیں۔ سلطنت کا استحکام اور اس کا بہتر سے بہتر انتظام و انصرام، شفاخانوں اور درس گاہوں کا قیام اپنی جگہ نہایت ضروری چیزیں ہیں اور اس راہ میں جدوجہد ایک مسلمان کے لیے ذریعۂ نجات بھی بن سکتی ہے۔ مگر ہم اس سلسلہ میں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ یہ سب کوششیں ایک مسلمان کے لیے صرف اسی صورت میں مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں جب ان کے پیچھے صرف خدا کی رضا جوئی کا جذبہ کارفرما ہو۔ اور اگر نیت کا سرچشمہ گدلا ہو گیا تو یہ سب کارنامے چاہے دنیاوی اعتبار سے کتنے ہی مہتم بالشان ہوں مگر ایک مسلم کے لیے بالکل عبث اور بیکار بلکہ ضرر رساں ہیں۔ کیونکہ یہ سب عدل کی اس میزان میں بالکل بے وزن ثابت ہوں گے جو حشر کے دن لوگوں کے اعمال تولنے کے لیے نصب کی جائیگی۔ وہاں تو انسان کی وہی کارگزاریاں وزنی ثابت ہونگی جن کی بنیاد اخلاص پر ہو، جو شخصی سُود و زیاں یا اجتماعی مصالح پر مبنی نہ ہوں بلکہ صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے کی جائیں۔ ایک مومن کا مطلوب و مقصود سوائے خدا کی خوشنودی کے اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور اس کا حصول ہی اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ ایک اپنی سعی و جہد کو خدا کی رضا جوئی کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور دوسرا اُسے مادی ترقی کے معیار پر جانچنے کی کوشش کرتا ہے ایک خدا ناشناس انسان کی نظر میں کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنے لیے، یا اگر وہ ذرا ایثار پیشہ ہے تو اپنی قوم اور اپنے وطن کے لیے مادی خوشحالی کا زیادہ سے زیادہ سامان فراہم کرے۔ یہی چیز اُس کے لیے اقدارِ حیات یا "خوب و ناخوب" کے پیمانے متعین کرتی ہے۔ وہ دنیا میں جو کچھ سوچتا ہے، یا جو کچھ کرتا ہے اُس کا منتہائے مقصود مادی طاقت اور قوت کا حصول ہے

یا دوسرے لفظوں میں یہی اُس کا "عُقبیٰ" و "آخرت" ہے۔ اس کے برعکس ایک خدا پر ایمان رکھنے والا انسان اگرچہ اپنی "عمرِ گریزاں" اسی مادّی دنیا میں بسر کرتا ہے اور اس کے ذرائع و وسائل سے متمتع بھی ہوتا ہے لیکن وہ اپنے افکار و اعمال کا محرک مادّی طاقت اور قوت کی فراہمی کو نہیں بناتا بلکہ زندگی کے ہر کام میں اپنے مالک کی رضا تلاش کرتا ہے۔ اس بنا پر زندگی بسر کرنے کے جو ضابطے وہ اختیار کرتا ہے وہ دنیاوی کامرانیوں اور سربلندیوں کے نقطۂ نظر سے طے نہیں پاتے بلکہ خالق کی خوشنودی کی اساس پر مرتب کیے جاتے ہیں۔ وہ مادّی فائدوں اور وقتی مصلحتوں سے یکسر بلند و بالا ہوتے ہیں اور اُن کی رفیع الشان عمارت صرف اخلاق کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔

"عقبیٰ" اور "آخرت" کے نقطۂ نظر میں اس اختلاف کی وجہ سے دونوں کے جزا اور سزا کے تصورات بھی ایک دوسرے سے یکسر الگ اور جداگانہ ہیں۔ ایک دنیا پرست کے نزدیک چونکہ زندگی اسی زمان و مکان کے اندر مقید ہے اس لیے وہ یہ سمجھتا ہے کہ اُسے اپنے اعمال کا صلہ بھی صرف اسی دنیا میں ملے گا۔ اگر وہ کوئی نیک کام کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اپنی زندگی مادّی اعتبار سے بہتر اور آرام دہ بن جائے۔ اور پھر اس سے آنے والی نسلوں کو خوشحالی نصیب ہو اور اگر وہ کسی بُرے کام کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ خود بھی دنیوی فوائد و لطائف سے محروم ہو اور مرتے وقت فاقہ مستی کا یہ طوق آنے والے لوگوں کے گلے میں ڈال کر یہاں سے رخصت ہو جائے۔ اُس شخص کی جنت عظیم الشان کوٹھیاں، سرسبز و شاداب کھیتیاں، پھلدار درخت، زیادہ سے زیادہ مال پیدا کرنے والے بڑے بڑے کارخانے اور برق رفتار سواریاں ہیں۔ اور ان چیزوں سے محرومی اس کی نظر میں دوزخ ہے۔

اس کے برعکس ایک مسلمان اس دنیا اور اس کے محدود وسائل و اسباب کو مکافاتِ عمل کے لیے بالکل ناکافی خیال کرتا ہے اور اس بات پر محکم یقین رکھتا ہے کہ آب و گل کی اس دنیا کے

خاتمہ پر ایک حشر برپا ہوگا جس میں حق تعالیٰ بے حجاب ہوکر انسانوں کے سامنے آئیں گے اور اُن کے اعمال کا فیصلہ کریں گے ۔ وہ لوگ جنھوں نے خدا کے دیئے ہوئے آئین و ضوابط کے مطابق زندگی بسر کی ہوگی انھیں فلاح و کامرانی کا تاج پہنا کر جنت میں داخل کیا جائے گا اور راہِ حق سے انحراف کرنے والے نامراد ہوکر آتشِ دوزخ میں جھونک دیئے جائیں گے ۔ جنت کی آسائش اور دوزخ کا عذاب اگرچہ دنیا کی اس آزمائش گاہ میں کامیابی اور ناکامی کے فطری نتائج ہیں لیکن اُن کا اس عالمِ رنگ و بُو سے کوئی تعلق نہیں ۔ وہ ایک بالکل الگ کائنات ہے جو محسوسات اور زمان و مکاں کے اُن بندھنوں سے یکسر آزاد ہے جن میں کہ ہم اس عارضی زندگی میں جکڑے ہوئے ہیں ۔ اس لیے وہاں کامیابی اور ناکامی کا معیار بھی اس دنیا کے معیارات سے بالکل مختلف ہوگا ۔ یہ عین ممکن ہے کہ یہاں ایک شخص دنیوی اعتبار سے نہایت کامیاب ہو ۔ وہ اپنے لیے ، اپنی قوم کے لیے یا ابنائے جنس کے لیے مادی سربلندی کا پورا پورا سامان فراہم کرے اور اس لحاظ سے اس کا انجام بھی "بخیر" ہو ، لیکن خدا کے حضور میں اُس کے حصے بجز ذلت اور رسوائی کے اور کوئی چیز نہ آنے پائے ۔ بالکل اسی طرح یہ بھی عین ممکن ہے کہ ایک شخص پوری زندگی معاشی بدحالی اور فاقہ مستی میں بسر کرے ، شریر لوگ اُسے تپتی ہوئی ریت پر لٹائیں ، وقت کے جبار اور قہار اُس کے جسم کو دہکتے ہوئے انگاروں سے داغیں ، اُسے ہر طرف سے رسوا اور ذلیل کرنے کی ناپاک کوششیں کی جائیں اور وہ اسی کس مپرسی اور مظلومیت کی حالت میں اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے ، پھر آنے والی نسلوں کے لیے بھی وہ کوئی مادی چیز ترکہ میں نہ چھوڑے مگر ان سب ناکامیوں کے باوجود وہ خدا کے ہاں فائز المرام ہو ۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں آخرت کا وہ تصور جو ایک مسلمان کے نزدیک خدا کی رضا جوئی کے بعد عمل کا سب سے بڑا محرک ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ جنت کا حصول یا اس سے محرومی دراصل پروردگار عالم کی خوشنودی یا ناراضگی کا ہی عملی اظہار ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا ۔

کسی نظامِ حیات میں محسوسات کے اس عالم سے ماوراء ثواب و عذاب کا یہ عقیدہ انسان کو حیوانی سطح سے اٹھا کر اُسے اشرف المخلوقات کے بلند درجہ پر لے جاتا ہے اور انسانیت کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ دنیاوی نفع و نقصان یا دوسرے لفظوں میں "مادی سود و زیاں" کو اپنے عمل کا مدار بنانے کی بجائے اخلاق کو اپنے اقوال و افعال کی اساس بنائے انسان کو جانور پر جو امتیاز حاصل ہے وہ صرف یہ ہے کہ جانور یہ کام جبلتوں کی تحریک پر کرتا ہے اور انسان اپنے رویّہ اور طرزِ عمل میں اخلاقی اصولوں کا پابند ہوتا ہے۔

پھر آخرت کا یہ تصور جو اسلام پیش کرتا ہے اس حقیقت کا آئینہ دار بھی ہے کہ اس دین کو پیش کرنے والی کوئی ایسی ازلی و ابدی ذات ہے جو ہر قسم کی دنیوی غرض یا مادی مصلحت سے بالکل بے پرواہ ہے اور اس نے اس کی تشکیل خالص اخلاق کی بنیادوں پر کی ہے۔ اس میں بلاشبہ مادی فلاح و بہبود کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے مگر اس چیز کو اس کا مبدء یا اساس نہیں ٹھہرایا گیا۔ اس میں اشیاء و اعمال کے وزن کرنے اور ان کی تقویم کے لیے دوسری میزان اور دوسرا مقوّم ہے اور وہ اُن کا دینی یا اخلاقی نفع یا اُخروی اجر ہے۔

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت میں جو ایک گہرا تعلق اور رابطہ موجود ہے۔ تاریخ کے پورے صفحات اُس کے شاہد ہیں۔ دنیا کی جن جن قوموں میں خدا کا تصور پایا جاتا ہے اُن میں آخرت کا عقیدہ بھی کسی نہ کسی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ خدا کا تصور جتنا صحیح اور نکھرا ہوا ہوگا اتنا ہی اُن کا عقیدۂ آخرت بھی درست اور واضح ہوگا اور جتنا جتنا خدا پر ایمان کمزور ہوگا اُسی تناسب سے آخرت پر یقین بھی مضمحل ہوتا چلا جائے گا۔ ان صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم ان دونوں کے باہمی تعلق کا پوری طرح جائزہ لیں۔ یہاں ہم صرف اس امر سے بحث کریں گے کہ تہذیبِ جدید نے خدا کے معاملے میں جو گمراہیاں پھیلائی ہیں انہوں نے عقیدۂ آخرت کو کس طرح متاثر کیا ہے۔

مذہب اور اس کے مسائل سے معمولی دلچسپی رکھنے والا آدمی بھی اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ مذہب کے دائرہ میں اصل اور فیصلہ کن چیز یہ نہیں کہ ہم کسی بلند و بالا ہستی کے وجود کو مانتے ہیں یا نہیں بلکہ اس ضمن میں اساسی اور بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں یا نہیں کہ جس خالق نے ہمیں وجود بخشا ہے، ہمیں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں دی ہیں، اُس نے ہمیں زندگی گزارنے کا کوئی ایسا ضابطہ بھی دیا ہے یا نہیں جو ہمیں اس دنیا میں رہتے ہوئے اس کے دامِ تزویر سے محفوظ رکھے اور ہمیں اس قابل بنائے کہ ہم اپنے دامن کو اس کے کانٹوں میں الجھائے بغیر اس کی سرحد کو عبور کر جائیں۔ مذہب اور الحاد کے درمیان اصل بنائے نزاع یہی ضابطۂ حیات ہے اور یہی وہ اصل وجہ ہے جس کی بنا پر ایمان باللہ کے ساتھ ساتھ ایمان بالرسالت کو بھی نجات کے لیے ایک ضروری شرط قرار دیا گیا ہے۔ جو شخص رسالت کو نہیں مانتا وہ درحقیقت خدا کا اور اُس کے دئیے ہوئے آئین و ضوابط کا انکار کرتا ہے وہ بے شک کھلا ہُوا منکرِ خدا نہ ہو مگر اس بات کا ضرور قائل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انسان کی عملی زندگی سے کوئی علاقہ یا تعلق نہیں۔

خدا کے وجود کا مجرد اقرار ممکن ہے کبھی کبھی زندگی کے مصائب و شدائد برداشت کرتے ہوئے ہمیں کچھ سہارا دے دے لیکن اس قسم کے کمزور اور "جزوی ایمان" سے ضلالتوں اور گمراہیوں کی وہ تاریکیاں کافور نہیں ہو سکتیں جو شیطان اور اُس کی ذریت نے اس دنیا میں پھیلا رکھی ہیں۔ اُن کو دُور رکھنے کے لیے تو ایک ایسے خدا پر ایمان لانے کی ضرورت ہے جس کی فرماں روائی انسانی زندگی کے سارے گوشوں پر محیط ہو اور جو ہر قدم پر انسان کی دستگیری اور رہنمائی کرے۔

جو فرد یا قوم جس حد تک مالک الملک کو دنیاوی معاملات سے بے دخل کرے گی اُسی حد تک اُس کی "آخرت" اسی مادی دنیا تک محدود ہو گی۔ جب ایک شخص اس کارگہِ حیات میں اس غلط تصور کے ساتھ شریک ہوتا ہے کہ خدا کا تعلق زندگی کے صرف ایک گوشے سے ہے تو وہ لامحالہ حیاتِ انسانی کے بیشتر شعبوں کے لیے خود اپنے آئین و ضوابط وضع کر یگا۔ ظاہر بات ہے

کہ ان اصولوں کی تشکیل و تدوین صرف دنیوی نفع و نقصان کی بنیاد پر ہی کی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے حق وہ قرار پائے گا جس سے کسی فرد یا قوم کو دنیاوی فوائد و لذائذ حاصل ہوں اور ہر وہ چیز باطل ٹھہرائی جائے گی جس سے ان میں کمی واقع ہو۔ اس حال میں خواہ خدائی خالقِ کائنات ہی کی تسلیم کی جائے مگر عملی فرمانروائی کا منصب مادیت کو حاصل ہوگا اور اسی کے دیئے ہوئے ضابطوں کے مطابق اس مادی دنیا میں افراد یا اقوام اپنے کیے کی جزا اور سزا پانے کی خواہشمند ہونگی۔

"دنیوی آخرت" کا یہ غلط تصور دراصل دین و دنیا کی دوئی کا فطری نتیجہ ہے۔ جب زندگی کے معتد بہ حصہ پر مادیت کی حکمرانی تسلیم کر لی جائے تو پھر ہمیں لازمی طور پر یہ بات بھی ماننی پڑیگی کہ آب و گِل کی یہی دنیا ہماری "آخرت" بھی ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جب ایک انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ اُس کے مالک نے اُسے پوری زندگی کے لیے کوئی ضابطہ نہیں دیا تو وہ لازمی طور پر دنیاوی سود و زیاں کے نقطۂ نظر سے اس دنیا میں عمل کرتا ہے اور پھر اسی کے مطابق مادہ کی اس محدود دنیا میں اپنی سعی و جہد کے نتائج و ثمرات دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ ایسی آخرت کو تسلیم نہیں کرتا جو مادی دنیا سے ماورا ہو۔

بالکل اسی طرح وہ شخص جو اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ اُس کے خدا نے اُس کی تخلیق کر کے اُسے بالکل آزاد نہیں چھوڑ دیا بلکہ زندگی بسر کرنے کا ایک ایسا اخلاقی ضابطہ بھی دیا ہے جو مادی نفع و نقصان سے بالکل ماورا ہے۔ ایسا شخص کس طرح یہ باور کر سکتا ہے کہ مادی دنیا کی یہ جولانگاہ اُس کی "آخرت" بھی بن سکتی ہے اور یہ حقیر سے دنیاوی فوائد اُس کے اخلاقی اعمال کے ثمرات بھی ہو سکتے ہیں

پھر اسی سلسلہ میں ایک اور پہلو بھی نہایت قابلِ غور ہے۔ جب ایک انسان یہ کہتا ہے کہ اُس کی آخرت صرف اسی مادی دنیا میں ہوگی اور زندگی کی سرحد کے اُس طرف اُسے اپنے اعمال کی

جزا اور سزا دی جائے گی تو وہ خود اپنے بارے میں اس امر کا اقرار کرتا ہے کہ اس کی حیثیت اس کارخانۂ حیات میں ایک عارضی اور اتفاقی شے کی سی ہے جو فطرت کی اندھی قوتوں کی نہ صرف تخلیق ہے بلکہ اُن کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونا بھی ہے۔ کوئی انسان خواہ اسے مانے یا اس سے انکار کرے مگر یہ چیز اس "دنیوی آخرت" کے تصور کا بالکل منطقی نتیجہ ہے۔ جب نیکی محض دنیوی فائدہ کی ہم معنی ہو اور بدی محض زر و مال کے خسران کا دوسرا نام سمجھ لیا جائے اور اعمال صالح وہ قرار پائیں جن سے اہلِ قوم یا وطن کو مادی اعتبار سے فائدہ پہنچے تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ انسان کی اپنی الگ کوئی حیثیت نہیں بلکہ وہ اجتماعیت کے عظیم کارخانے میں ایک بے جان پرزہ ہے۔ اس کے سارے افکار و اعمال، اس کی ساری خواہشات و تمنائیں چاہے وہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں صرف مادیت کی کرشمہ سازی ہیں۔ وہ اپنی حماقت سے بیشک اپنے آپ کو کائنات کا مرکز تصور کرتا رہے مگر یہ اس کی ابلہ فریبی ہے۔ اجتماعیت کے اس بحرِ بیکراں میں اس کی اصل حیثیت وہی ہے جو سمندر میں ایک قطرہ کی، یا انسانوں کے ریوڑ میں ایک حیوانِ ناطق کی ہے حیاتِ انسانی کا یہ تصور نہ صرف انسان کے اندر روح کے وجود کی نفی کرتا ہے بلکہ وہ انسان کو جوہرِ انسانیت سے بھی محروم کر کے اُس کی انفرادیت اور خودی کا گلا گھونٹتا ہے۔ اس نظریہ کا مقصد یہ ہے کہ فرد اجتماعیت کے مادی مفاد کی خاطر اپنی ہر چیز، خواہ وہ زر و مال ہو یا دین و ایمان، قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ جرمنی کے وزیرِ داخلہ نے غالباً اسی خیال کی ترجمانی کی تھی جب اُس نے واشگاف الفاظ میں کہا:

> "قوم کا مفاد ہی در اصل حق کا سب سے بڑا معیار ہے۔ حق وہ ہے جس سے جرمن قوم کو نفع حاصل ہو اور باطل وہ ہے جس سے جرمن قوم کو نقصان پہنچے۔ ہٹلر کی خدمت جرمنی کی خدمت ہے اور جرمنی کی خدمت خدا کی خدمت ہے"

چنانچہ دیکھیے کہ دنیا کی جن قوموں نے آخرت کا انکار کیا ہے یا جنھوں نے اس دنیا کو "آخرت" سمجھا ہے وہ آہستہ آہستہ اس بات پر مجبور ہو گئی ہیں کہ افراد کو اجتماعیت میں اس

طرح گم کردیں کہ ان کا کوئی الگ وجود باقی نہ رہے۔ اِس طرزِ فکر نے انسانیت کی جس طرح سے مٹی پلید کی ہے وہ ایک نہایت لمبی داستان ہے۔ یہاں ہم اُس کے صرف چند اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اس کا پہلا اثر جو انسانیت نے قبول کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی مادی ترقی ہی انسانی زندگی کا منتہائے مقصود قرار پائی ہے۔ اور اس وجہ سے انسانیت کے مختلف گروہ اور طبقے مادی اسباب کی فراہمی کے لیے ہر قسم کے اخلاقی ضوابط کو نظر انداز کرتے ہوئے دیوانہ وار جد و جہد کر رہے ہیں۔ دنیاوی مال و متاع کو سمیٹنے کی اس مجنونانہ ہوس نے نہ صرف ایک انسان کو دوسرے سے ٹکرا دیا ہے بلکہ اُس کے اندر مستقل خوف و ہراس کی کیفیت بھی پیدا کر دی ہے جس سے خود غرضی، سنگدلی، بخل، تنگ نظری، بد عہدی، اور خیانت جیسے ذلیل خصائص بڑی سرعت کے ساتھ ابھر رہے ہیں۔

دوسرے اس طرزِ خیال سے انسانیت کا مستقبل بھی سراسر تاریک ہو گیا ہے۔ جو فلسفہ انسانی خودی کے عملِ تخلیق کو مادہ کی محدود دنیا میں مقید کرتا ہے وہ ممکن ہے اس کرۂ ارضی پر صنعتی اور زراعتی انقلاب لے آئے مگر زندگی کی شبِ تاریک کو کبھی بھی سحر میں تبدیل نہیں کر سکتا۔ احساس و وجدان یا قلب و روح ہی درحقیقت وہ قوتیں ہیں جن کے ذریعہ انسان زمان و مکان کے جابرانہ تسلط سے نجات حاصل کر کے ایک بہتر اور شادکام زندگی کا تصور کرتا ہے جسے وہ مذہب کی اصطلاح میں آخرت کہتا ہے۔ اور اگر اس سے یہ قوتیں سلب کر لی جائیں تو پھر اُس کی زندگی کی ساری شمعیں خود بخود گل ہو جاتی ہیں۔ اس نظریۂ حیات کی مضرتوں پر بحث کرتے ہوئے فلسفۂ تاریخ کا مشہور مفکر رقمطراز ہے:

"جب ہم یہ اصول تسلیم کرتے ہیں کہ ایک فرد سماج کے لیے ہی زندہ ہے تو اس سے انسانی زندگی کا کعبۂ مقصود ہی بدل جاتا ہے۔ اب انسانی زندگی میں سب سے

اہم چیز افراد کی روحانی نشو و نما نہیں رہتی بلکہ قوموں کے سطوت و جبروت میں اضافہ قرار پاتا ہے۔ اگر اسے صحیح مان کر ہم اس کے مطابق عمل کرنا شروع کریں تو دنیا میں اس سے سنگین قسم کی بد اخلاقی جنم لیگی۔ یہ نظریہ کہ فرد محض سماج کا ایک بے جان حصّہ ہے کیڑوں مکوڑوں کے متعلق تو درست ہو سکتا ہے مگر اس کا اطلاق انسانوں پر کبھی نہیں ہو سکتا۔ جب ہم ایک فرد کو محض ایک قوم کا جزو سمجھتے ہیں تو اس سے خدا اور بندے کے تعلقات کی خود بخود نفی ہو جاتی ہے اور خدا پرستی کی جگہ قوم پرستی لے لیتی ہے"۔

انسان کی انسانیت یا دوسرے لفظوں میں اس کی "انفرادی انا" جو اخلاق و اقدار کا منبع ہے اور جس کی وجہ سے ملائکہ نے بھی اُس کی برتری کو تسلیم کیا، صرف اُسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے جب ایک انسان کے دل میں یہ خیال راسخ ہو کہ مادی دنیا کے اس ہنگامہ کے خاموش ہو جانے پر ایک حشر برپا ہوگا جس میں دنیا کے سب لوگ اپنے اپنے نامۂ اعمال کے ساتھ خدا کے حضور میں پیش ہوں گے اور انہیں اُن کی کارگزاریوں کی انفرادی طور پر جزا اور سزا دی جائے گی۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو بے شمار مقامات پر واضح فرمایا ہے۔ ہم یہاں صرف چند آیات نقل کرتے ہیں:

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (۲۳-۶)

پھر جب صور پھونکا جائیگا تو اس روز ان میں کوئی نسبی تعلق باقی نہ رہیگا اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھیں گے۔ جن کے اعمال کا پلّہ بھاری ہوگا وہی لوگ فلاح پائیں گے اور جن کے اعمال ہلکے ہوں گے وہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے خود اپنے آپ کو نقصان میں ڈالا۔

یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ

وہ دن جب کہ ہر نفس ہر اس نیکی کو جو اس نے کی ہے

خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ (۳:۲)	اور اس برائی کو جو وہ کر چکا ہے حاضر پائیگا۔
وَكُلَّ إِنْسَانٍ أَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۔ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۔ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۭ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۱۷:۲)	ہر انسان کا شگون ہم نے اس کے اپنے گلے میں لٹکا رکھا ہے اور قیامت کے روز ہم ایک نوشتہ اس کے لیے نکالیں گے جسے وہ کھلی کتاب کی طرح پائیگا۔ پڑھ اپنا نامۂ اعمال آج اپنا حساب لگانے کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔ جو کوئی راہِ راست اختیار کرے اس کی راست روی اس کے لیے ہی مفید ہے اور جو گمراہ ہوا اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

یہ تصوّر کہ انسان منفرداً اللہ کا خلیفہ ہے اور اسی لحاظ سے وہ اپنے اعمال کا ذمّہ دار اور جواب دہ ہے اور اللہ کی عدالت میں ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت میں پیش ہوگا۔ انسانی روح یا اخلاقی انا کی موجودگی کی ایک محکم دلیل ہے۔ اور اگر یہ تصوّر ختم ہو جائے تو انسان پھر انسانیت کی بلند سطح سے گر کر چوپاؤں کی سطح پر آجاتا ہے جسے اجتماعیت کی قوت بے زبان گلہ کی طرح جس طرح چاہتی ہے بالکل میکانکی طور پر ہانک کر لے جاتی ہے۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہوگی کہ توحید، رسالت اور آخرت کے تصورات کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خدا کی ہستی کا اقرار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر رسالت اور خدا کے دیئے ہوئے ضابطۂ حیات کو تسلیم نہ کیا جائے۔ اور اس ضابطۂ حیات پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر گوشے میں اسی سے ہدایت اور رہنمائی حاصل کریں اور مادی سود و زیاں سے یکسر بلند ہو کر اس کی پابندی کو اپنا منتہائے

مقصود سمجھیں۔ اس اخلاقی ضابطہ کی پابندی کے نتائج ممکن ہے کچھ مادی دنیا میں بھی ظاہر ہوں مگر مادہ کی یہ محدود دنیا اُن کے پوری طرح بارآور ہونے کے لیے موزوں نہیں۔ یہاں اعمال کو ناپنے کے لیے جو پیمانے موجود ہیں ان سے چونکہ مادی اشیا کی ہی پیمائش کی جا سکتی ہے اس لیے انسانی فطرت اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ اُس کے وہ اعمال جن کا محرک صرف خدا کی رضا جوئی ہو، اس کو تولنے کے لیے بھی کوئی میزانِ عدل قائم کی جائے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ میزان اس مادی دنیا میں تو نصب نہیں کی جا سکتی اس کا قیام تو وہیں ہو سکتا ہے جہاں مادیت کی کوئی عملداری نہ ہو۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے توحید رسالت اور آخرت کو ساتھ ساتھ رکھا ہے اور ان تینوں کو ایمان کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اس بات کا تو دعویٰ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ تینوں ایک ہیں مگر یہ چیز وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ تینوں ایک ہی زنجیر کے مختلف حلقے ہیں اور ان کے مابین ایک گہرا ربط اور تعلق موجود ہے اور اگر کسی ایک کے اندر کوئی معمولی سی تبدیلی کی جائے تو دوسرا خود بخود متاثر ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لیے ہم صرف دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔

اہلِ مغرب نے جس روز دین و دنیا کی دوئی کے فلسفہ کو قبول کیا اُسی دن سے خالقِ کائنات ایک سوچی سمجھی پلان کے تحت دنیا کے معاملات سے بے تعلق کر دیئے گئے۔ پھر خداوند تعالیٰ کا دخل جس طریق سے انسان کی روزمرہ زندگی کے ساتھ کم ہوتا گیا بالکل اسی انداز سے آخرت کے عقیدہ پر بھی مُردنی چھا گئی۔ دین و دنیا کی اس تفریق کا پہلا اثر یہ رونما ہوا کہ انسان نے خالق کے وجود کے محض اقرار کو نجات کے لیے کافی سمجھ لیا اور اس کے دیئے ہوئے ضابطہ کو یکسر نظرانداز کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اخلاقی اصولوں کو اپنا رہنما بنانے کی بجائے مادی مصلحتوں کو اپنے اعمال کا محرک ٹھہرایا۔ جھوٹ اگر دنیا میں نقصان کا موجب ہوا تو وہ گناہ تھا اور اگر فائدہ کا ذریعہ ثابت ہوا تو وہ عین ثواب بن گیا۔ صداقت اگر دنیا میں جلبِ منفعت کی بنیاد بنی تو وہ نیکی قرار پائی ورنہ سب سے بڑی برائی سمجھی جانے لگی۔ الغرض اس دنیوی زندگی سے آگے کسی اچھے یا بُرے نتیجے کے مرتب

ہونے کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ اور انسان نے صرف انہی افعال و اعمال کو اہمیت دینا شروع کی جن کے نتائج اس دنیا میں نظر آسکتے ہوں یا دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ انسان کی مادّی زندگی سے جس قدر دُور ہوتا چلا گیا بالکل اسی طرح انسان نے آخرت کو کھینچ تان کر زمان و مکان کی حدبندیوں میں محدود کر دیا۔ جس سوسائٹی میں حق و باطل میں تفریق خداوند تعالیٰ کی کتاب اور اُس کے پیغمبر کی تعلیمات کی بجائے مادی نفع و نقصان کی بنیاد پر کی جائے اس میں اگر "دنیوی آخرت" کا غلط تصور ترقی پا جائے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔

اہلِ مغرب کے علاوہ خود مسلمانوں کے ہاں اس نظریاتی تغیر و تبدل کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ ہمارے وہ خیر خواہ جن کی نظروں کو یورپ کی مادی ترقی نے خیرہ کر رکھا ہے اس امت کی فلاح اسی میں دیکھتے ہیں کہ کسی طرح مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی کو مذہب کے اثر سے آزاد کر دیا جائے۔ ان سب حضرات نے اس مقصد کے حصول کے لیے جو تدابیر اختیار کی ہیں اُن کی نوعیت قریب قریب ایک جیسی ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے سنت کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کیے جاتے ہیں تاکہ قرآنِ حکیم میں من مانی تاویلات کا دروازہ کھل سکے۔ پھر بڑی حکمت و دانائی سے عصری تقاضوں اور وقتی مصلحتوں کا تذکرہ اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں فرض کے مقابلے میں مصلحت کی اہمیت ابھرنے لگتی ہے۔ اس کے بعد خیر و شر کے پیمانے اور جزاو سزا کے تصورات تبدیل کرنے کے لیے کچھ اصول گھڑ لیے جاتے ہیں۔ آپ سرسید مرحوم اور اُن کے ہم خیال لوگوں کی تحریروں کا ایک سرسری جائزہ لیں تو اُن میں یہ طرزِ فکر پورے طور پر کارفرما نظر آئے گا۔

اسی قسم کی ایک منظم کوشش اب حال میں متجددین کا ایک نیا گروہ کر رہا ہے۔ یہ لوگ اپنے پیشروؤں کی طرح مغربی افکار و نظریات سے مرعوب ہی نہیں بلکہ مغلوب و مفتوح بھی ہیں۔ اور امت کی بہتری اسی میں سمجھتے ہیں کہ اس کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو "دنیوی سود و زیاں" کی

بنیاد پر استوار کیا جائے۔ کیونکہ ان کے نزدیک مادی ترقی کے حصول کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ چیز صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب ملت کو اسلام کے دیئے ہوئے ضابطوں سے نجات دلا کر اُسے دنیوی مصلحتوں کا غلام بنا دیا جائے۔ اس کے لیے عملی طریقے صرف دو ہی ہیں ایک تو یہ کہ دین کا اس قوم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق باقی نہ رہنے اور بالفرض اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر تعلیماتِ الٰہی میں لچک پیدا کرنے کا کوئی ایسا اصول وضع کر لیا جائے جس کی مدد سے اس دین کو وقتی مصلحتوں کے سانچوں میں بڑی آسانی کے ساتھ ڈھالا جا سکے۔

اس قوم کا اپنے دین کے ساتھ جو ایک گہرا تعلق ــــ چاہے اس کی بنیاد جذبات ہی سہی ــــ صدیوں سے رہا ہے اُس کے پیشِ نظر یہ بات تو ممکن نہیں کہ اُسے کھل کر یہ کہا جا سکے کہ تم دین کو خیر باد کہہ دو۔ اس لیے چار و ناچار قوم کے ان "غمگساروں" کو اسے معراجِ ترقی پر پہنچانے کے لیے دوسرا راستہ ہی اختیار کرنا پڑا ہے۔

دین کے اندر لچک پیدا کرنے اور اُسے عصری اور وقتی مصلحتوں کے تقضیات کا پابند بنانے میں جو چیزیں سب سے زیادہ مانع ہیں اُن میں ایک تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور دوسرا عقیدۂ آخرت۔ حضورؐ کی سنت کے اقرار کے یہ معنی ہیں کہ ہم یہ تسلیم کریں کہ حضورؐ نے پیغامِ الٰہی کو جس صورت میں زمان و مکان کے اندر محفوظ کر کے اسے ایک پیکرِ محسوس عطا فرمایا ہے وہ ہمارے لیے ایک آئیڈیل کا درجہ رکھتی ہے اور اس اعتبار سے ہر دَور میں لائقِ اتباع ہے۔ قرآن کی ہر تعبیر جو اس صورت سے الگ کوئی دوسرا نقشہ مرتب کرتی ہو وہ بالکل غلط ہے ــ یہ عقیدہ قرآن مجید کی من مانی تاویلات کی راہ میں سب سے زیادہ مزاحم ہے۔ اس مزاحمت کو یہ کہکر دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حضورؐ نے جو کچھ فرمایا اور کیا وہ وقت کا ایک تقاضا اور مطالبہ تھا اُسے ایک مستقل شکل دینا خدا کے منشا کے منافی ہے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد اب قرآن مجید کی تشریح و تعبیر کا حق صرف "مرکزِ ملت" کو پہنچتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں حضورؐ کی زندگی میں جو مقام دین کے اندر خود حضورؐ کو حاصل تھا وہ اب "مرکزِ ملت" کو حاصل ہے اور یہ ادارہ اِس

بات کا مجاز ہے کہ وہ وقتی مصلحتوں اور عصری تقاضوں کے تحت دین کے اندر مناسب تبدیلیاں کرتا ہے۔ اس نظریہ نے نہ صرف اسلام کے ازلی و ابدی احکام کو وقتی مصلحتوں کے تابع کر دیا ہے بلکہ اس سے رسالت کے بلند مقام کو بھی شدید صدمہ پہنچا ہے اور دین میں ہر فتنے کو گھسنے کا پورا پورا موقع مل گیا ہے۔ یہ وقتی یا عصری مطالبات جن کو اس قدر اہمیت دی جا رہی ہے دنیوی اغراض یا مادی مصالح ہی ہیں۔

اس راہ کا دوسرا سنگِ گراں عقیدۂ آخرت ہے۔ مسلمانوں کا یہ نظریہ کہ انسان کو اپنے اعمال کی جزا و سزا اس دارِ فانی میں نہیں بلکہ اس کے فنا ہونے پر ایک حیاتِ ابدی میں ملے گی اُن کی اخلاقی انا کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ یہ اعتقاد ہی انہیں اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ دنیوی نفع و نقصان سے یکسر بے پروا ہو کر اس دنیا میں حق و صداقت کے گواہ بنیں

مسلمانوں کے اس اخلاقی طرزِ عمل کو ایک مصلحت پرستانہ طرزِ عمل میں تبدیل کرنے کے لیے اُن کے ذہن میں بڑی چابکدستی کے ساتھ یہ نظریہ راسخ کیا جا رہا ہے کہ جزا و سزا اور آخرت کے وہ تصورات جو تمہارے ہاں صدیوں سے موجود ہیں وہ سب اعتباری باتیں ہیں، یہ سب جاہل اور کم علم ملاؤں کی اختراعات ہیں۔ ان تصورات کو فروغ دینے اور پھیلانے میں ان "فریب کاروں" کی غرض یہ ہے کہ تمہیں وعدۂ فردا کے ذریعہ اس دنیا سے غافل کر دیا جائے اور وہ خود ہر قسم کے مزے لوٹتے رہیں۔ اگر جنت و دوزخ کوئی چیز ہے تو اسی دنیا میں موجود ہے۔ اس بنیادی تبدیلی کے بعد نیکی اور بدی یا خیر و شر کے معیار بھی یکسر بدل گئے ہیں۔ اب "عمل صالح" وہ عمل قرار پایا ہے جس کے نتائج اس عالم رنگ و بو میں دیر کے بعد رونما ہوں۔ یہ ہے وہ طریق جس سے دین کے اُن سارے معتقدات کو جو درحقیقت دین کی جان ہیں اور ایک مسلمان کے اندر اخلاقی احساس و شعور کو بیدار کرتے ہیں، ایک لگے بندھے منصوبہ کے تحت مٹایا جا رہا ہے تاکہ ان کی جگہ مادی محرکات کو بڑی آسانی کے ساتھ اس امت کی رہنما قوت بنا دیا جائے۔

محسنِ انسانیت ﷺ

ایک نظر میں

(حضورِ پاک کی شخصیت کا اجمالی خاکہ)

از
جناب نعیم صدیقی صاحب

خطابت نظمِ الٰہی کا ایک اہم جزو خطابت ہے۔ محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم پیغام کے حامل تھے اور اس کے لیے خطابت ناگزیر ضرورت تھی۔ خطابت یوں بھی عربوں کی دولت تھی پھر قریش تو اس صفت سے خاص طور پر مالا مال تھے۔ عرب اور قریش کے خطیبانہ ماحول سے حضورؐ بہت بلند رہے۔ فریضۂ قیادت نے جب بھی تقاضا کیا آپ کی زبان کبھی نسیم سحر کی طرح، کبھی آبِ جُو کی طرح اور کبھی تیغِ برق دم کی طرح متحرک ہو جاتی۔

وعظ و تقریر کی کثرت سے آپ نے پرہیز کیا اور معاشرہ کی ضروریات اور اس کے ظرف کو دیکھ کر اعتدال سے قوتِ خطابت کا استعمال کیا۔ مسجد میں خطاب فرماتے تو اپنی چھڑی پر سہارا لیتے اور میدانِ جنگ میں تقریر فرمانا ہوتی تو کمان پر ٹیک لگاتے۔ کبھی کبھار سواری پر سے خطاب کیا ہے۔ تقریر میں جسم دائیں بائیں جھوم جاتا، ہاتھوں کو حسبِ ضرورت حرکت دیتے، تقریر میں بعض مواقع پر والذی نفسی بیدہٖ یا والذی نفس محمد بیدہٖ (قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یا محمدؐ کی جان ہے) کہہ کر قسم کھاتے۔ لہجے میں بھی اور چہرے پر بھی دل کے حقیقی جذبات جھلکتے اور سامعین پر اثر انداز ہوتے۔ اس انسانِ اعظمؐ کے خطابات دلوں کو ہلا دیتے تھے ہم یہاں صرف دو مثالیں دیں گے۔ حُنین وطائف کے معرکہ کے بعد حضورؐ نے مالِ غنیمت تقسیم کیا تو مؤلفۃ القلوب، کی قرآنی مد کے تحت نو مسلم رؤسائے مکہ کو اس میں سے بہت سا

حصہ دیا تاکہ ان کے دل مزید نرم ہوں اور وہ احسان کے رشتے سے اسلامی ریاست کے ساتھ مربوط تر ہو جائیں۔ انصار میں کچھ لوگوں نے عجیب سے احساسات کی رَو دوڑا دی۔ کہا گیا کہ :

"رسولؐ اللہ نے قریش کو خوب انعامات دیئے اور ہمیں محروم رکھا۔ حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک خون کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔"

"مشکلات میں ہم یاد آتے ہیں اور حاصلِ غنیمت دوسرے لوگ لے جاتے ہیں۔"

یہ چرچے حضورؐ کے کانوں تک بھی پہنچے۔ ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا اور اس میں انصار کا اجتماع بلایا گیا۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ تم لوگوں نے ایسی اور ایسی باتیں کہی ہیں ؟ جواب ملا کہ "آپؐ نے جو سُنا وہ صحیح ہے۔ مگر یہ باتیں ہم میں سے ذمہ دار لوگوں نے نہیں کہیں، کچھ نوجوانوں نے ایسے فقرے کہے ہیں۔" واقعہ کی تحقیق کے بعد آپؐ نے یہ تقریر کی :

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم لوگ پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو ہدایت دی ؟ تم منتشر اور پراگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو متحد و متفق کیا ؟ تم مفلس تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو آسودہ حال کیا ؟ [ہر سوال پر انصار کہتے جاتے تھے کہ بلاشبہ اللہ اور رسولؐ کا بہت بڑا احسان ہم پر ہے] ۔

نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمدؐ! تم کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تمہاری تصدیق کی، تم کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی، تم جب مفلس ہو کر آئے تھے تو ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔ تم جواب میں یہ کہتے جاؤ اور میں کہتا جاؤں گا کہ ہاں تم سچ کہتے ہو۔ لیکن اے گروہِ انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمدؐ کو لے کر اپنے گھروں کو جاؤ۔"[1]

کلام کا اتار چڑھاؤ دیکھیے، خنجرِ خطابت کی اس دھار کو دیکھیے جو نازک جذبات سے صیقل کی گئی تھی، پھر اس کی روانی دیکھیے، مطالب کی پلٹیاں دیکھیے، پھر یہ غور کیجیے کہ کس طرح

[1] بخاری جلد دوم صفحہ ۶۲

خطیبؐ نے بالآخر مطلوبہ کیفیت سامعین میں پوری طرح اُبھار دی۔ انصار بے اختیار چیخ اٹھے کہ "ہم کو صرف محمدؐ درکار ہیں"۔

ابتدائی دورِ دعوت میں کوہِ صفا کے خطبہ کے علاوہ متعدد بار آپؐ نے قریش کے سامنے تقاریر فرمائی ہیں۔ اس دور کے ایک خطبہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکْذِبُ اَھْلَہٗ، وَاللّٰہِ لَوْکَذَبْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا کَذَبْتُکُمْ، وَلَوْغَرَرْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَاغَرَرْتُکُمْ۔ وَاللّٰہِ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَاِلَی النَّاسِ کَافَّۃً۔ وَاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ وَلَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ وَلَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ وَلَتُجْزَوْنَ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْٓءِ سُوْٓءً وَاِنَّھَا لَجَنَّۃٌ اَبَدًا اَوْلَنَارٌ اَبَدًا"[۱]

ترجمہ:۔ "قافلے کا دیدبان اپنے ساتھیوں کو کبھی غلط اطلاع نہیں دیا کرتا۔ خدا کی قسم اگر بالفرضِ محال میں اور سب لوگوں سے جھوٹ کہنے پر تیار بھی ہو جاتا تب بھی تم سے غلط بات ہرگز نہ کہتا۔ اگر بالفرضِ محال میں دوسرے تمام لوگوں کو ہلاکت و خطرہ سے دوچار کر دیتا تو بھی تم کو کبھی خطرہ میں مبتلا نہ کرتا۔ اُس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں میں تمہاری طرف خصوصیت سے اور تمام انسانوں کی طرف جامع طور سے خدا کا مقرر کردہ رسول ہوں۔ بخدا تم کو لازماً مرنا ہے جیسے کہ تم سو جاتے ہو اور پھر مرنے کے بعد تم کو جی اٹھنا ہے جیسے کہ تم نیند سے بیدار ہو جاتے ہو۔ تم سے لازماً تمہارے کاموں کا حساب لیا جانا ہے اور تمہیں بھلے کا بدلہ بھلا اور بُرے کا بدلہ بُرا ضرور ملنا ہے۔ یا تو ہمیشہ کے لیے جنت ہوگی، یا ہمیشہ کے لیے دوزخ!"

کیا ہی سادہ اندازِ بیان ہے۔ کتنا عقلی اور جذباتی اپیل ہے۔ داعی کی خیر خواہی ایک ایک

---

[۱] جمہرۃ الخطب ص

لفظ سے ٹپکی پڑتی ہے۔ پھر یقین کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ چھوٹے سے اس خطبے میں تمثیل سے بھی کام لیا گیا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کی بنیادی دعوت پوری طرح سموئی ہوئی ہے۔

حضورؐ کے معرکۃ الآرا خطبے دو اور ہیں جن میں سے ایک فتح مکہ کے موقع پر اور دوسرا حجۃ الوداع کے موقع پر دیا۔ ان خطبوں کا مزاج انتہائی انقلابی ہے اور ان میں ایمان، اخلاق اور اقتدار تینوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ حجۃ الوداع کا خطبہ تو گویا ایک دورِ نو کے افتتاح کا اعلان ہے۔

عام سماجی رابطہ

بڑے بڑے کام کرنے والے لوگ بالعموم رابطۂ عام کے لیے وقت نہیں نکال سکتے اور نہ ہر طرف توجہ دے سکتے ہیں بعض بڑے لوگوں میں خلوت پسندی اور خشکیٔ مزاج پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ کبر کا شکار ہو کر اپنے لیے ایک عالم بالا بنا لیتے ہیں۔ مگر حضورؐ انتہائی عظمت کے مقام پر فائز ہو کر اور تاریخ کا رُخ بدلنے والے کارنامے انجام دے کر عوامی حلقوں سے پوری طرح مربوط تھے اور جماعت اور معاشرہ کے افراد سے شخصی اور نجی تعلق رکھتے تھے۔ علیحدگی پسندی یا کبر یا یبوست کا شائبہ تک نہ تھا۔ درحقیقت آپ نے جس نظامِ اخوت کی تاسیس فرمائی تھی یہ اس کا اہم تقاضا تھا کہ لوگ باہم دگر مربوط رہیں، ایک دوسرے کے کام آئیں اور ایک دوسرے کے حقوق پہچانیں۔ بخلاف اس کے آج جو تمدن مغرب میں نشوونما پا گیا ہے اس میں "کسے را باکسے کارے نباشد" کی فضا بڑی انسانیت کُش ہو گئی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں اس فضا کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ آئیے ہم حضورؐ کو عام سماجی رابطوں کے دائرے میں دیکھیں۔

آپؐ کا معمول تھا کہ راستہ میں ملنے والوں سے سلام کہتے اور سلام کہنے میں پہل کرتے۔ کسی کو پیغام بھجواتے تو ساتھ سلام ضرور کہلواتے۔ کسی کا سلام پہنچایا جاتا تو بھیجنے والے کو بھی اور لانے والے کو بھی جدا جدا سلام کہتے۔ ایک بار لڑکوں کی ٹولی کے پاس سے گزرے تو ان کو سلام کیا۔ عورتوں کی جماعت کے قریب سے ہو کر نکلے تو ان کو سلام کیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اور گھر سے نکلتے ہوئے گھر کے لوگوں کو بھی سلام کہتے۔ احباب سے معانقہ بھی فرماتے اور مصافحہ بھی۔ مصافحہ سے ہاتھ اس وقت تک نہ کھینچتے جب تک دوسرا خود ہی اپنا ہاتھ الگ نہ کرتا۔

مجلس میں جاتے تو اس امر کو ناپسند کرتے کہ صحابہ تعظیم کے لیے کھڑے ہوں مجلس کے کنارے ہی بیٹھ جاتے، کندھوں پر سے پھاند کر بیچ میں گھسنے سے احتراز فرماتے۔ فرمایا: اَجْلِسُ کَمَا یَجْلِسُ الْعَبْد (اسی طرح اٹھتا بیٹھتا ہوں جس طرح خدا کا ایک بندہ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ روایت عائشہؓ) اپنے زانو ساتھیوں سے بڑھا کر نہ بیٹھتے۔ کوئی آتا تو اعزاز کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے۔ آنے والا جب تک خود نہ اٹھتا آپ مجلس سے الگ نہ ہوتے۔

اہلِ مجلس کی گفتگو میں غیر متعلق موضوع نہ چھیڑتے بلکہ جو سلسلۂ کلام چل رہا ہوتا اسی میں شامل ہو جاتے۔ چنانچہ نمازِ صبح کے بعد مجلس رہتی اور اس میں صحابہ سے خوب باتیں ہوتیں۔ جاہلیت کے قصے چھڑ جاتے اور ان پر خوب ہنسی بھی ہوتی[۱]۔ صحابہ شعر بھی پڑھتے۔ جس موضوع سے اہلِ مجلس کے چہروں سے اکتانے کا اثر محسوس ہوتا اسے بدل دیتے۔ ایک ایک فردِ مجلس پر توجہ فرماتے تاکہ کوئی یہ نہ محسوس کرے کہ کسی کو اس پر آپ نے فوقیت دی ہے۔ دورانِ تکلم کوئی شخص غیر متعلق سوال چھیڑ دیتا تو اسے نظر انداز کر کے گفتگو جاری رکھتے اور سلسلہ پورا کر کے پھر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ خطاب کرنے والے کی جانب سے اس وقت تک رُخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود مُنہ نہ پھیر لیتا۔ کان میں کوئی سرگوشی کرتا تو جب تک وہ بات پوری کر کے منہ نہ ہٹا لیتا آپ برابر اپنا سر اسی کی طرف جھکائے رکھتے۔ کسی کی بات کو کبھی نہ کاٹتے۔ اِلّا یہ کہ حق کے خلاف ہو۔ اس صورت میں یا تو ٹوک دیتے، یا چہرے پر ناگواری آجاتی یا اٹھ کر چلے جاتے۔ ناپسند تھا کہ کھڑے کھڑے کوئی اہم بحث چھیڑ دی جائے۔ ناپسندیدہ باتوں سے اوّل تو اعراض فرماتے ورنہ گرفت کرنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ براہِ راست نام لے کر ذکر نہ کرتے بلکہ عمومی انداز میں اشارہ کرتے یا جامع طور پر نصیحت کر دیتے۔ انتہائی تکدر کی صورت میں جو فقط دینی امور میں ہوتا تھا احباب کو احساس دلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ یہ طریقِ اظہار تھا کہ یا تو شخص متعلق کے آنے پر سلام قبول نہ کرتے یا عدمِ التفات دکھلاتے۔ ناپسندیدہ آدمی کے آنے پر بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ چنانچہ ایک بار کوئی ایسا آپ

---

[۱] روایت جابرؓ بن سمرہ (مسلم)

بئس اخو العشیرہ یا بئس ابن العشیرہ (اپنے گروہ کا بُرا آدمی) سمجھتے تھے۔ مگر آپؐ نے بے تکلفی سے بات چیت کی۔ حضرت عائشہؓ کو اس پر تعجب ہُوا تو آپؐ نے فرمایا: "قسم ہے کہ قیامت کے دن خدا کے حضور وہ شخص بدترین آدمی کا مقام پائے گا جس سے لوگ اس کی بدسلوکی کے ڈر سے ملنا جُلنا چھوڑ دیں۔"[۱]

کسی کی ملاقات کو جاتے تو دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کر اطلاع دینے اور اجازت لینے کے لیے تین مرتبہ سلام کہتے۔ جواب نہ ملتا تو بغیر کسی احساس تکدر کے واپس چلے آتے۔ رات کو کسی سے ملنے جاتے تو اتنی آواز میں سلام کہتے کہ اگر وہ شخص جاگتا ہو تو سن لے اور سو رہا ہو تو نیند میں خلل نہ آئے۔

بدن یا لباس سے کوئی شخص تنکا یا مٹی وغیرہ ہٹاتا تو شکریہ ادا کرتے ہوئے فرماتے "مَسَحَ اللہُ عَنْکَ مَا تَکْرَہُ" (خدا تم سے ہر اُس شے کو دُور کرے جو تمہیں بُری لگے)۔ ہدیہ قبول کرتے اور جواباً ہدیہ دینے کا خیال رکھتے۔ کسی شخص کو اتفاقاً کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو اسے بدلہ لینے کا حق دیتے اور کبھی عوض میں کوئی ہدیہ دیتے۔ کوئی شخص نیا لباس پہن کر سامنے آتا تو فرماتے: حَسَنَۃٌ، حسنۃ، اَبلِ واَخلِق (یعنی خوب ہے خوب! دیر تک پہنو، بوسیدہ کرو)۔ بدسلوکی کا بدلہ بُرے سلوک سے نہ دیتے بلکہ عفو و درگزر سے کام لیتے۔ دوسرے کے قصور معاف کر دینے کی اطلاع کے ساتھ اپنا عمامہ علامت کے طور پر بھیج دیتے۔ کوئی پکارتا تو خواہ وہ گھر کا آدمی ہو یا رفقا میں سے، ہمیشہ "لبیک" (حاضر ہوں) کہتے۔

بیماروں کی عیادت کو اہتمام سے جاتے۔ سرہانے بیٹھ کر پوچھتے "کَیْفَ تَجِدُکَ" (تمہاری طبیعت کیسی ہے؟)؟ بیمار کی پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے۔ کبھی سینے اور پیٹ پر دستِ شفقت پھیرتے اور کبھی چہرے پر۔ کھانے کو پوچھتے۔ بیمار کسی چیز کی خواہش کرتا تو اگر مضر نہ ہوتی تو منگوا دیتے۔ تسلی دیتے اور فرماتے "لَا بَاسَ طَھُوْرٌ اِنْشَاءَ اللہُ" (فکر کی کوئی بات نہیں، خدا نے چاہا تو جلد

---

[۱] المواہب اللدنیہ ج ۱ صفحہ ۲۹۱ (بخاری)

صحت یاب ہو گئے)۔ شفا کے لیے دعا فرماتے۔ حضرت سعد کے لیے تین بار دعا کی۔ مشرک چچاؤں کی بیمار پرسی بھی کی، ایک یہودی بچے کی عیادت بھی فرمائی (جو ایمان لے آیا)۔ اس کام کے لیے کوئی دن اور وقت مقرر نہ تھا۔ جب بھی اطلاع ملتی اور وقت ملتا تشریف لے جاتے۔

ایک بار حضرت جابرؓ بیمار پڑے، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیقِ خاص حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ لیے ہوئے پیدل خاصی دوری تک چل کر گئے (مدینہ کی آبادی پھیلی ہوئی تھی)۔ حضرت جابر بے ہوش پڑے تھے۔ آپؐ نے دیکھا۔ پھر وضو کیا، پانی کے چھینٹے دیئے، دعا کی اور مریض کی حالت سنبھلنے لگی۔ چنانچہ حضرت جابرؓ نے بات چیت کی اور اپنے ترکہ کے متعلق مسائل پوچھے۔

تواضع کی انتہا یہ تھی کہ منافقین کے لیڈر عبداللہ بن ابی تک کی عیادت فرمائی۔

جب کسی شخص کی وفات ہو جاتی تو تشریف لے جاتے۔ عالمِ نزع میں بلایا جاتا یا از خود اطلاع پا کر پہنچتے تو توحید اور توجہ الی اللہ کی تلقین کرتے۔ میت کے لواحقین سے ہمدردی کا اظہار فرماتے، صبر کی نصیحت کرتے اور چلّانے اور بکا کرنے سے روکتے۔ سفید کپڑوں میں اچھا کفن دینے کی تاکید کرتے اور تجہیز و تکفین میں جلدی کراتے۔ جنازہ اٹھتا تو ساتھ ساتھ چلتے۔ مسلمانوں کے جنازے خود پڑھاتے اور مغفرت کے لیے دعا کرتے۔ کوئی جنازہ گزرتا — تو چاہے وہ غیر مسلم کا ہو — کھڑے ہو جاتے (بیٹھے رہنے کی روایت بھی ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ قیام کا طریقہ منسوخ ہو گیا تھا — ملاحظہ ہو: زاد المعاد ج ۱ ص ۱۴۵)۔ تلقین فرماتے کہ میت کے گھر والوں کے لیے دوسرے لوگ کھانا پکا کر بھجوائیں۔ (کجا آج یہ الٹی رسمیت مسلط ہے کہ میت والے گھر میں دوسروں کی ضیافت ہوتی ہے)۔ ناپسند تھا کہ باقاعدہ مجلسِ تعزیت کا سلسلہ ایک رسمی ضابطے کے طور پر کئی روز جاری رہے۔

کوئی مسافر سفر سے واپس آتا اور حاضری دیتا تو اس سے معانقہ کرتے۔ بعض اوقات پیشانی چوم لیتے۔ کسی کو سفر کے لیے رخصت فرماتے تو کہتے کہ بھائی ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔

محبت آمیز بے تکلفی میں کبھی کبھی احباب کے ناموں کو مختصر کر کے بھی پکار لیتے جیسے ابا ہریرہ کے بجائے "ابا ہر"۔ حضرت عائشہ کو کبھی کبھار "عائش" کہہ کر پکارتے۔

بچوں سے بہت دلچسپی تھی۔ بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے، پیار کرتے، دعا فرماتے۔ ننھے بچے لائے جاتے تو ان کو گود میں لے لیتے۔ ان کو بہلانے کے لیے عجیب سے کلمے کہتے یعنی خَوقَہ خَوقَہ فِیْ عَیْنِ کُلِّ بَقَّۃ[1]۔ ایک معصوم بچے کو بوسہ دیتے ہوئے فرمایا: "اِنَّھُمْ لَمِنْ رَیْحَانِ اللّٰہِ (یہ بچے تو خدا کے باغ کے پھول ہیں)۔ بچوں کے نام تجویز کرتے۔ بچوں کو قطار میں جمع کر کے انعامی دوڑ لگواتے کہ دیکھیں کون ہمیں پہلے چھو لیتا ہے۔ بچے دوڑتے ہوئے آتے تو کوئی سینہ پر گرتا، کوئی پیٹ پر۔ بچوں سے دل لگی بھی کرتے۔ مثلاً حضرت انسؓ کو کبھی کبھی پیار سے کہا "یا ذَاالاُذُنَیْن!" (او، دو کانوں والے) حضرت انسؓ کے بھائی ابوعمیر کا پالا ہوا ممولا مر گیا تو وہ اداس بیٹھا تھا۔ حضورؐ آئے تو پکار کر کہا: "یا اباعمیر! ما فعل النُّغَیر؟" (ابوعمیر! تمہارے ممولے کو کیا ہوا) عبداللہ بن بشیر کے ہاتھ ان کی والدہ نے ہدیہ کے طور پر انگور حضورؐ کی خدمت میں بھیجے۔ صاحبزادے میاں راستے میں کھا گئے۔ بعد میں معاملہ کھلا تو آپؐ پیار سے عبداللہ کے کان پکڑ کر کہتے "یا غُدَر! یا غُدَر! (او دھوکے باز، او دھوکے باز!)۔ سفر سے آ رہے ہوتے تو جو بچہ راستے میں ملتا اسے سواری پر بٹھا لیتے۔ چھوٹا ہوتا تو آگے، بڑا ہوتا تو پیچھے۔ فصل کا میوہ پہلی بار آتا تو دعائے برکت مانگ کر کم عمر بچے کو دے دیتے۔ آپ کے پیشِ نظر تھا کہ یہی نئی پود آئندہ تحریکِ اسلامی کی علمبردار ہوگی۔

بوڑھوں کا احترام فرماتے۔ فتح مکہ کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے ضعیف العمر والد کو جو بینائی سے بھی محروم ہو چکے تھے، بیعتِ اسلام کے لیے آپؐ کی خدمت میں لائے۔ فرمایا: انہیں کیوں تکلیف دی، میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔

مروت کی انتہا یہ تھی کہ مدینہ کی ایک عورت جس کی عقل میں کچھ فتور تھا، آتی ہے اور کہتی ہے کہ مجھے کچھ کہنا ہے۔ آپ اسے فرماتے ہیں کہ تم چلو، کسی کوچے میں انتظار کرو، میں ابھی آتا ہوں۔ چنانچہ اس کی بات جا کر سنی اور اس کا کام کر دیا[2]۔ ایسا ہی ایک واقعہ عدی بن حاتم

---

[1] بعض لوگوں نے معنی نکالنے کی کوشش کی ہے (ہر مچھر کی آنکھ میں ٹڈی کا جثہ ہے) مگر بظاہر یہ ویسے ہی کلمات ہیں جیسے ہر ملک میں بچوں کو بہلانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

[2] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۵

نے بھی دیکھا تھا اور حضورؐ کی مروت کو نبوت کی علامت کے طور پر لیا۔

میل جول کی زندگی میں آپ کے حُسنِ کردار کی تصویر حضرت انس نے خوب کھینچی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"میں دس برس تک حضورؐ کی خدمت میں رہا اور آپ نے کبھی مجھے اُف تک نہ کہی۔ کوئی کام جیسا بھی کیا، نہیں کہا کہ یہ کیوں کیا اور کوئی کام نہ کیا تو نہیں کہا کہ کیوں نہیں کیا۔ یہی معاملہ آپ کا خادموں اور کنیزوں کے ساتھ رہا۔ آپؐ نے ان میں سے کسی کو کبھی نہیں مارا۔"

اس کی تصدیق حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ازواج یا خادموں میں سے نہ کبھی کسی کو مارا، نہ کسی سے کوئی ذاتی انتقام لیا — بجز اس کے کہ آپؐ خدا کے راستے میں جہاد کریں یا قانونِ الٰہی کے تحت اس کی مقرر کردہ حرمتوں کے تحفظ کے لیے کارروائی کریں۔

خالص نجی زندگی اکثر بڑے لوگ وہ کہلاتے ہیں جو پبلک لائف کے لیے ایک مصنوعی کردار کا جُبہ پہنے رکھتے ہیں جو نجی زندگی میں اتر جاتا ہے۔ باہر دیکھیے تو بڑی آن بان ہے، گھر پہنچے تو انتہائی پستی میں جا گرے۔ باہر سادگی اور تواضع دکھائی، گھر کو پلٹے تو عیش و تنعم میں ڈوب گئے۔ پبلک اور پرائیویٹ زندگی میں کسی شخص کے ہاں جتنا زیادہ اختلاف اور فاصلہ ہوتا ہے، اتنا ہی اس کا مرتبہ ادنیٰ ہوتا ہے۔ حضورؐ کو دیکھیے تو ایک ہی رنگ گھر میں بھی ہے اور گھر سے باہر بھی۔

حضرت عائشہؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ رسولِ خدا اپنے گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا: آپ آدمیوں میں سے ایک آدمی تھے۔ اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال خود ہی کر لیتے (کہ ان میں کوئی جوں وغیرہ نہ چڑھ آئی ہو)، بکری کا دودھ خود دوہتے اور اپنی ضرورتیں خود ہی پوری کر لیتے[1]۔ نیز اپنے کپڑوں کو خود ہی پیوند لگا لیتے۔ اپنے جوتے کی مرمت کر لیتے اور یہ کہ اپنے ڈول کو ٹانکے لگا لیتے، بوجھ اٹھاتے، جانوروں کو چارہ ڈالتے، کوئی خادم ہوتا تو اس کے

---

[1] ملاحظہ ہو: شمائل ترمذی۔ باب ما جاء فی تواضع رسول اللہ صلعم۔

ساتھ مل کر کام کرا دیتے، (مثلاً اسے آٹا پسوا دیتے) کبھی اکیلے ہی مشقت کر لیتے[1] بازار جانے میں عار نہ تھی۔ خود ہی سودا سلف لاتے اور ضرورت کی چیزیں ایک کپڑے میں باندھ کر اٹھا لاتے۔

لوگوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ رسولِ خدا جب گھر میں ہوتے تو کیا رنگ رہتا۔ حضرت عائشہؓ بتاتی ہیں: "اَلْیَنُ النَّاسِ بَسَّامًا ضَاحِکًا" (سب سے زیادہ نرم خو، متبسم، خندہ جبیں!) اور اس لینت کی شان یہ تھی کہ "کبھی کسی خادم کو جھڑکا نہیں"[2] حق یہ ہے کہ "رسولِ خدا سے بڑھ کر کوئی بھی اپنے اہل و عیال کے لیے شفیق نہ تھا"۔ (مسلم)

ایک بار حضرت امام حسینؓ کے پوچھنے پر حضرت علیؓ نے بیان کیا کہ رسولِ خدا گھر میں آتے تو اپنا وقت تین طرح کی مصروفیتوں میں صرف کرتے۔ کچھ وقت خدا کی عبادت میں صرف ہوتا، کچھ وقت اہل و عیال کے لیے تھا اور کچھ وقت اپنے آرام کے لیے۔ پھر انہی اوقات میں سے ایک حصہ ملاقاتیوں کے لیے نکالتے جن میں مسجد کی عام مجالس کے علاوہ خصوصی گفتگو کرنے والے احباب یا مہمان آ کر ملتے یا کچھ لوگ ضروریات و حاجات لے کر آتے[3] دیکھا جائے تو آرام کے لیے بہت ہی کم وقت رہ جاتا تھا۔

ازواجِ مطہرات کے نان و نفقہ اور مختلف ضروریات کا انتظام بھی آپؐ کو کرنا ہوتا۔ پھر ان کی تعلیم و تربیت بھی آپؐ کے ذمے تھی۔ پھر انہی کے ذریعے طبقۂ خواتین کی اصلاح کا کام جاری رہتا، عورتیں اپنے مسائل لے کر آتیں اور ازواجِ مطہرات کی معرفت دریافت کرتیں۔ اس کے باوجود گھر کی فضا کو آپؐ نے کبھی خشک اور بوجھل نہ بننے دیا اور نہ اس میں کوئی مصنوعی انداز پیدا ہونے دیا بلکہ ایک انسانی گھر کی طرح تھا جس کی فضا میں فطری جذبات کا مدوجزر رہتا۔ اس میں آنسوؤں کی جھپک بھی ہوتی اور تبسموں کی لمعانی بھی، محبتیں بھی کارفرما تھیں اور کبھی کبھار رشک کا کھچاؤ بھی پیدا ہوتا، پریشانیاں بھی رہتیں اور تفریح کے لمحات بھی آتے۔ حضورؐ اس باغ میں آتے تو نسیم کے جھونکے

۱؎ ۲؎ المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۳

۳؎ شمائل ترمذی۔ باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

کی طرح آتے اور ایک عجیب شگفتگی پھیل جاتی۔ بات چیت ہوتی، کبھی کبھار قصہ گوئی بھی ہوتی اور دلچسپ لطائف بھی وقوع میں آتے مثلاً اپنا ایک واقعہ حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے خزیرہ (گوشت کا قیمہ کر کے پانی میں پکاتے اور پھر اس پر آٹا چھڑکتے جو ساتھ ہی پکتا) تیار کیا حضرت سودہؓ بھی موجود تھیں اور رسولِ خدا دونوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ بے تکلفی کی فضا تھی۔ میں نے سودہ سے کہا کہ کھاؤ۔ انہوں نے انکار کیا پھر اصرار سے کہا کہ کھاؤ۔ انھوں نے انکار کیا۔ پھر اصرار سے کہا کہ نہیں ضرور کھانا ہوگا۔ انھوں نے پھر انکار کیا۔ ادھر سے پھر کہا گیا کہ اس میں سے کھاؤ ورنہ میں اٹھا کر تمہارے منہ پر مل دوں گی۔ حضرت سودہؓ نے بھی ہٹ دکھائی۔ حضرت عائشہ نے خزیرہ میں ہاتھ ڈالا اور واقعی حضرت سودہؓ کے چہرے پر لیپ دیا۔ اس بے تکلفی پر حضورؐ خوب ہنسے اور سودہ سے کہا کہ تم اس کے منہ پر ملو تاکہ حساب برابر ہو جائے۔ چنانچہ سودہؓ نے ایسا ہی کیا۔ حضورؐ مکرر ہنسے[1]۔

ایک موقع پر حضرت ابوبکرؓ آئے تو حضرت عائشہ کو حضورؐ کے ساتھ شوخی سے بات کرتے پایا۔ غضبناک ہو کر مارنے کو چلے۔ حضورؐ نے ان کو ٹھنڈا کیا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اسی غصے میں جناب صدیق چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد آپؐ نے بڑے تیکھے انداز میں حضرت عائشہؓ سے کہا: دیکھا! ہم نے تمہیں اس شخص سے کیسے بچا لیا۔

گھریلو زندگی کے اس فطری اتار چڑھاؤ کو بعض لوگ اسلامیت کے تصور سے فروتر پاتے ہیں اور خصوصاً نبی کریمؐ کے گھر کا نقشہ کچھ ایسا ذہن میں رکھتے ہیں کہ اس میں کوئی غیر انسانی تپلے رہتے تھے جن میں نہ کوئی جذبہ تھا، نہ خواہش ــــ حالانکہ وہ گھر انسانوں کا گھر تھا اور اس میں سارے انسانی جذبات کام کرتے تھے، مگر اس گھر میں معصیت نہ تھی۔ اس لحاظ سے وہ نمونے کا گھر تھا۔ راتوں کو جب حضورؐ بستر پر ہوتے تو اہل و عیال سے عام باتیں ہوتیں ــــ کبھی گھریلو امور پر، کبھی عام مسلمانوں کے مسائل پر۔ یہاں تک کہ کبھی قصہ کہانی بھی سناتے۔ ایک بار آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے ام زرع کی کہانی بیان کی

[1] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۶

اس کہانی میں گیارہ عورتیں اپنے اپنے خاوندوں کا کردار آپس میں بیان کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک عورت ام زرع اپنے خاوند ابوزرع کا من موہنا کردار پیش کرتی ہے۔ یہ کہانی ادبی لحاظ سے بڑی دلچسپ ہے۔ خاتمے پر حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میں بھی تمہارے حق میں ویسا ہی ہوں جیسا کہ ابوزرع ام زرع کے لیے تھا۔ اسی طرح کسی دوسرے موقع پر کوئی قصہ سنایا تو سننے والیوں میں سے ایک نے کہا کہ یہ تو خرافہ کے قصوں جیسا ہے (عرب میں خرافہ کی ایک روایتی شخصیت تھی جس سے بہت سے حیرت ناک قصے منسوب تھے) حضورؐ نے کہا کہ جانتی بھی ہو کہ خرافہ کی کیا حقیقت تھی پھر آپؐ نے خرافہ کی روایتی شخصیت کا قصہ بھی بیان کیا کہ بنو عذرہ کے اس آدمی کو جن پکڑ کر لے گئے تھے اور کچھ عرصہ کے بعد واپس چھوڑ گئے۔[۱]

عمر بھر معمول رہا کہ رات کے دوسرے نصف حصے کے اوائل میں بیدار ہو کر مسواک و وضو کے بعد تہجد ادا فرماتے[۲]۔ قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہوئے بعض اوقات اتنا لمبا قیام فرماتے کہ قدم مبارک متورم ہو جاتے[۳]۔ صحابہؓ نے اس مشقت پر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو آپؐ کو غفرانِ خاص سے نوازا ہے (قَدْ غَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ) پھر اس قدر حضورؐ جان کیوں گھلاتے ہیں؟ فرمایا: "اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا" کیا میں خدا کا احسان شناس اور شکر گزار بندہ نہ بنوں[۴]؟

گھر اور اس کے ساز و سامان کے متعلق آپؐ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ زندگی اس طرح گزاری جائے جیسے مسافر گزارتا ہے۔ فرمایا کہ میری مثال اس مسافر کی سی ہے جو تھوڑی دیر کے لیے سائے میں آرام کرے اور پھر اپنی راہ لے۔ مراد یہ ہے کہ جو لوگ آخرت کو منتہا بنائیں اور دنیوی زندگی کو ادائے فرض یا امتحان کے طور پر گزاریں اور جنہیں یہاں کسی بڑے نصب العین کے لیے جدوجہد کرنی ہو ان کے لیے کیا موقع ہے کہ اعلیٰ درجہ کے مسکن بنائیں اور ان کو ساز و سامان سے آراستہ کریں بعد پھر

---

[۱] شمائل ترمذی۔ باب ماجاء فی کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی السمر [۲] زاد المعاد
[۳] شمائل ترمذی باب ماجاء فی عبادۃ رسول اللہ صلعم [۴] ایضاً

ان میں مگن رہ کر لطف اٹھائیں۔ چنانچہ آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں نے نہ اعلیٰ درجہ کی عمارتیں بنائیں اور نہ ان میں اسباب جمع کیے اور نہ ان کی زینت و آرائش کی فکر کی۔ ان کے گھر بس "بہترین مسافرانہ قیام گاہیں تھیں"[۱]۔ ان میں گرمی سردی سے بچنے کا اہتمام تھا، جانوروں کی مداخلت سے بچاؤ کا انتظام تھا، پردہ داری (PRIVACY) کا بندوبست تھا اور حفظانِ صحت کے ضروری پہلو ملحوظ تھے[۲]۔ حضورؐ نے مسجد کے ساتھ ازواج کے لیے حجرات (چھوٹے چھوٹے کمرے) بنوا لیے تھے۔ بجز صفائی کے اور کسی طرح کی آرائش نہ تھی۔ صفائی میں ذوقِ نبوت یہاں تک تھا کہ صحابہ کو تاکید فرمائی "گھروں کے آنگن صاف رکھو"[۳]۔

سازوسامان میں چند برتن نہایت سادہ قسم کے تھے۔ مثلاً ایک لکڑی کا پیالہ (بادیہ) تھا۔ جس پر لوہے کے پتر لگے تھے اور کھانے پینے میں اس کا بکثرت استعمال ہوتا تھا۔ خوراک کا سامان جمع تو کیا ہوتا، روز کا روز بھی کافی مقدار میں میسر نہ ہوتا۔ بستر چمڑے کے گدّے پر مشتمل تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوتی تھی۔ بان کی بُنی ہوئی چارپائی رکھتے۔ ٹاٹ کا بستر بھی استعمال میں رہا جو دوہرا کرکے بچھایا جاتا۔ ایک بار چوہرا کرکے بچھایا گیا تو صبح دریافت فرمایا کہ آج کیا خصوصیت تھی کہ مجھے گہری نیند آئی اور تہجد چھوٹ گئی۔ معلوم ہونے پر حکم دیا کہ بستر کو پہلے ہی حال پر رہنے دیا جائے۔ زمین پر چٹائی بچھا کر بھی لیٹنے کا معمول تھا۔ بعض اوقات کھری چارپائی کے نشانات بدن پر دیکھ کر رفقائے خاص (مثلاً حضرت عمرؓ و عبداللہ بن مسعودؓ) رو دیئے[۴]۔

ذرا حضرت عمرؓ کا چشم دید نقشہ سامنے لائیے۔ واقعۂ ایلاء کے زمانے میں انھوں نے حضورؐ کو اس عالم میں دیکھا کہ "آپ کھری چارپائی پر لیٹے ہیں اور جسم پر نشان پڑ گئے ہیں، اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک طرف مٹھی بھر جَو رکھے ہیں، ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کیلی سے لٹک رہی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے"۔ حضورؐ نے رونے کا سبب پوچھا تو عرض کی

---

۱ زاد المعاد - فی تدبیرہ لامر المسکن - ج ۲ ص ۱۲۲ ۲ ایضاً ۳ روایت ابن المسیب (ترمذی)

۴ ملاحظہ ہو: شمائل ترمذی - باب ماجاء فی فراش رسول اللہ صلعم

کہ قیصر و کسریٰ تو عیش کریں اور آپؐ کا یہ حال رہے" فرمایا: عمرؓ! کیا تم اس پر خوش نہیں کہ وہ لوگ دنیا لے جائیں اور ہمیں آخرت ملے۔[۱]

اکل و شرب | کھانے پینے کا ذوق بہت نفیس تھا۔ گوشت سے خاص رغبت تھی، زیادہ ترجیح دست، گردن اور پیٹھ کے گوشت کو دیتے، نیز پہلو کی ہڈی پسند تھی۔ ثرید یعنی گوشت کے شوربے میں روٹی ڈبو کر تناول فرمانا مرغوب تھا۔ پسندیدہ چیزوں میں شہد، سرکہ، خربوزہ، ککڑی، لوکی، کھچڑی، مکھن وغیرہ اشیا شامل تھیں۔ دودھ کے ساتھ کھجور (بہترین مکمل غذا بنتی ہے) کا استعمال بھی اچھا لگتا اور مکھن لگا کے کھجور کھانا بھی ذوق میں شامل تھا۔ کھرچن (دیگ) سے بھی انس تھا۔ ککڑی نمک لگا کر اور خربوزہ شکر لگا کر بھی کھاتے۔ مریضوں کی پرہیزی غذا کے طور پر حریرہ کو اچھا سمجھتے اور تجویز بھی فرماتے۔ میٹھا پکوان بھی مرغوب خاص تھا۔ اکثر جَو کے ستو بھی استعمال فرماتے۔ ایک مرتبہ بادام کے ستو پیش کیے گئے تو یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہ امرا کی غذا ہے۔ گھر میں شوربا پکتا تو کہتے کہ ہمسائے کے لیے ذرا زیادہ بنایا جائے۔

پینے کی چیزوں میں نمبر ایک پر میٹھا پانی تھا۔ اور بطور خاص دو روز کی مسافت سے منگوایا جاتا۔ دودھ، پانی ملا دودھ (جسے کچی لسی کہا جاتا ہے) اور شہد کا شربت بھی رغبت سے نوش فرماتے۔ غیر نشہ دار نبیذ بھی قرینِ ذوق تھی۔ مشکیزے یا پتھر کے برتن میں پانی ڈال کر کھجور بھگو دی جاتی اور اسے متواتر دن بھر استعمال کرتے۔ لیکن وقت زیادہ ہونے پر چونکہ نشہ ہونے کا اندیشہ ہو جاتا لہٰذا پھنکوا دیتے۔ بہ روایت ابومالک اشعری یہ فرمایا بھی کہ میری امت میں سے بعض لوگ شراب پئیں گے اور اس کا نام بدل کر کچھ اور رکھ دیں گے (چنانچہ سلاطین مابعد نے نبیذ کے نام سے منشیات کا استعمال کیا)

افراد کا الگ الگ بیٹھ کر کھانا ناپسند تھا، اکٹھے ہو کر کھانے کی تلقین فرمائی۔ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کو اپنی شانِ فقر کے خلاف سمجھتے، اسی طرح دسترخوان پر چھوٹی چھوٹی پیالیوں اور طشتریوں میں کھانا رکھا جانا بھی خلافِ مزاج تھا۔ سونے چاندی کے برتنوں کو بالکل حرام فرما دیا تھا۔ کانچ، مٹی، تانبے اور لکڑی کے برتنوں کو استعمال میں لاتے رہے۔ دسترخوان پر ہاتھ دھونے کے بعد جوتا اتار کر بیٹھتے۔

---

[۱] مواہب اللدنیہ ج ا صفحہ ۲۲، نیز صحیح مسلم باب فی الرجل یطلق امرأتہ روایت عبداللہ ابن عباس۔

سیدھے ہاتھ سے کھانا لیتے اور اپنے سامنے کی طرف سے لیتے، برتن کے وسط میں ہاتھ نہ ڈالتے۔ ٹیک لگا کر کھانا پینا بھی خلافِ معمول تھا۔ دو زانو یا اکڑوں بیٹھتے۔ ہر لقمہ لینے پر بسم اللہ پڑھتے۔ ناپسندیدہ کھانا بغیر عیب نکالے خاموشی سے چھوڑ دیتے۔ زیادہ گرم کھانا نہ کھاتے۔ کبھی کبھار چھری سے پکا ہوا گوشت کاٹ کاٹ کر بھی کھایا ہے، مگر یہ پر تکلف طریقہ مرغوب نہ تھا[1]۔ کھانا ہمیشہ تین انگلیوں سے لیتے اور ان کو لتھڑنے نہ دیتے۔ کبھی کبھار میوہ یا پھل کھڑے ہو کر یا چلتے ہوئے بھی کھا لیا۔ دو پھل اکٹھے بھی کھائے، مثلاً ایک ہاتھ میں خربوزہ لیا اور دوسرے میں کھجور۔ کھجور کی گٹھلی الٹے ہاتھ سے پھینکتے۔ دعوت ضرور قبول فرماتے اور اگر اتفاقاً کوئی دوسرا آدمی (بات چیت کرتے ہوئے یا کسی اور سبب سے) ساتھ ہوتا تو اسے لے تو جاتے مگر صاحبِ خانہ سے اس کے لیے اجازت لیتے۔ مہمان کو کھانا کھلاتے تو بار بار اصرار سے کہتے کہ اچھی طرح بے تکلفی سے کھاؤ۔ کھانے کی مجلس سے بتقاضائے مروت سب سے آخر میں اٹھتے۔ دوسرے لوگ اگر پہلے فارغ ہو جاتے تو ان کے ساتھ ہی آپ بھی اٹھ جاتے۔ فارغ ہو کر ہاتھ ضرور دھوتے۔ دعا کرتے جس میں خدا کی نعمتوں کے لیے ادائے شکر کے کلمات ہوتے، نیز طلبِ رزق فرماتے اور صاحبِ خانہ کے لیے برکت چاہتے۔ کھانے کی کوئی چیز آتی تو حاضر دوستوں کو باصرار شریک کرتے اور غیر حاضر دوستوں کا حصہ رکھ دیتے۔ پھل وغیرہ کھانے کی مجلس میں ایک ایک دانہ لینے کی تربیت آپ نے دی۔ پانی غٹ غٹ کی آواز نکالے بغیر پیتے اور بالعموم تین بار پیالہ منہ سے الگ کر کے سانس لیتے اور ہر بار آغاز "بسم اللہ" سے اور اختتام "الحمد للہ والشکر للہ" پر کرتے۔ عام طریقہ بیٹھ کر پانی پینے کا تھا۔ مگر کبھی کبھی کھڑے ہو کر بھی پیا ہے۔ پینے کی چیز مجلس میں آتی تو بالعموم داہنی جانب سے دور چلاتے اور جہاں ایک دور ختم ہوتا، دوسرا وہیں سے شروع کرتے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو ترجیح دیتے، مگر داہنے ہاتھ والوں کے مقررہ استحقاق کی بنا پر ان سے اجازت لے کر ہی ترتیب توڑتے۔ احباب کو کوئی چیز پلاتے تو خود سب سے آخر میں پیتے اور فرماتے کہ "ساقی آخر میں پیا کرتا ہے"۔ کھانے پینے کی چیزوں میں پھونک مارنا یا ان کو سونگھنا ناپسند تھا

---

[1] روایت عمر بن امیہ (بخاری ومسلم)، نیز روایت عائشہؓ (ابو داؤد و بیہقی)

سانس میں بُو کا ہونا چونکہ خلاف مزاج تھا اس لیے کچی پیاز اور لہسن کا استعمال ہمیشہ ناپسند رہا۔ کھانے پینے کی چیزوں کو ڈھانکنے کا حکم دیا ہے۔ کوئی نیا کھانا سامنے آتا تو کھانے سے پہلے اس کا نام معلوم فرماتے زہر خورانی کے واقعہ کے بعد معمول ہو گیا تھا کہ اگر کوئی اجنبی شخص کھانا کھلاتا تو پہلے ایک آدھ لقمہ خود اسے کھلاتے۔[1]

ذوق کی اس نفاست کے ساتھ دوسری طرف اکثر اوقات فقر و فاقہ کا عالم درپیش رہا جس کی تفصیل ہم دوسری جگہ دیں گے۔ فرمایا أکل کما یأکل العبد۔ میرا کھانا پینا ایسا ہے جیسے (خدا کے) کسی بندے کا ہونا چاہیے۔

نشست و برخواست کبھی اکڑوں بیٹھتے کبھی دونوں ہاتھ زانوؤں کے گرد حلقہ زن کر لیتے۔ کبھی ہاتھوں کے بجائے کپڑا (چادر وغیرہ) لپیٹ لیتے۔ بیٹھے ہوئے ٹیک لگاتے تو بالعموم اُلٹے ہاتھ پر۔ فکر یا سوچ کے وقت بیٹھے ہوئے زمین کو لکڑی سے کُریدتے۔ سونے کے لیے سیدھی کروٹ سوتے اور دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر داہنا رخسار رکھ لیتے۔ کبھی چت بھی لیٹتے اور پاؤں پر پاؤں بھی رکھ لیتے مگر ستر کا اہتمام رکھتے۔ پیٹ کے بل اوندھا لیٹنا سخت ناپسند تھا اور اس سے منع فرماتے تھے۔ ایسے تاریک گھر میں سونا پسند نہ تھا جس میں چراغ نہ جلایا گیا ہو۔ کھلی چھت پر جس کی پردے کی دیوار نہ ہو، سونا اچھا نہ سمجھتے۔ وضو کر کے سونے کی عادت تھی اور سوتے وقت مختلف دعائیں پڑھنے کے علاوہ آخری تین سورتیں (سورۂ اخلاص اور معوذتین) پڑھ کر بدن پر دم کر لیتے۔[2] سوتے ہوئے ہلکی آواز سے خراٹے لیتے۔ رات میں قضائے حاجت کے لیے اُٹھتے تو فارغ ہونے کے بعد ہاتھ منہ ضرور دھو لیتے۔[3] سونے کے لیے ایک تہبند علیحدہ تھا۔ کرتا اتار کر ٹانگ دیتے۔

بشری حاجات ضرورت کے لیے چونکہ اس دور میں گھروں میں بیت الخلا نہ تھا اس لیے حضورؐ جنگل جاتے۔ عموماً اتنی دور تک جاتے (۲، ۲ میل تک) کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ ایسی نرم زمین تلاش کرتے کہ چھینٹے نہ اُڑیں۔ موقع حاجت پر پہلے بایاں قدم رکھتے اور پھر دایاں۔ بیٹھتے ہوئے

[1] ملاحظہ ہو شمائل ترمذی (ابواب متعلقہ) [2] مختلف اذکار و ادعیہ کو ہم دوسرے موقع پر لائیں گے [3] شمائل ترمذی

زمین کے بالکل قریب ہو کر مقامِ ستر سے کپڑا کھولتے۔ کسی ٹیلے وغیرہ کی آڑ ضرور لیتے۔ ضرورت کے لیے ہمیشہ جوتا پہن کر اور سر ڈھک کر نکلتے۔ قبلہ کی طرف منہ یا پشت کرنے سے اجتناب تھا۔ رفع حاجت کے وقت انگوٹھی الگ کر دیتے (واضح رہے کہ اس پر خدا و رسول کے اسماء کندہ تھے)۔ آبدست بالالتزام بائیں ہاتھ ہی سے کرتے۔ جائے ضرور سے الگ ہوتے ہوئے پہلے دایاں پاؤں اٹھاتے پھر بایاں۔

غسل کے لیے پردہ ضروری قرار دیا تھا۔ گھر میں نہاتے تو کپڑے کا پردہ تانا جاتا۔ کبھی بارش میں نہاتے تو تہ بند باندھ لیتے۔

چھینک پست آواز سے لیتے اور ہاتھ یا کپڑا منہ پر رکھ لیتے۔

سفر | سفر کے لیے جمعرات کو روانگی زیادہ پسند تھی۔ سواری کو تیز چلاتے۔ پڑاؤ سے صبح کے وقت کوچ کرنا معمول رہا۔ سفر (CAMP LIFE) میں جو اجتماعی کام درپیش ہوتے ان میں ضرور حصہ لیتے۔ چنانچہ ایک بار کھانا تیار کرنے کی مہم تھی۔ سارے ساتھیوں نے کام تقسیم کیے آپؐ نے بھی لکڑیاں چننا اپنے ذمہ لیا۔ کہا گیا کہ آپؐ تکلیف نہ کریں، ہم سب اس کام کے لیے کافی ہیں۔ فرمایا کہ مجھے امتیاز پسند نہیں[1]۔ سفر میں اپنی سواری پر باری باری کسی نہ کسی پیادہ ساتھی کو شریک کرتے۔ سفر سے رات میں واپس آنا پسند نہ تھا۔ آتے تو سیدھے گھر جانے کے بجائے مسجد میں جا کر نفل ادا کرتے۔ گھر میں اطلاع ہو جانے کے بعد اطمینان سے جاتے۔

جذبات | انسانیت کا کوئی تصور ہم جذبات کو الگ رکھ کر نہیں کر سکتے۔ حضورؐ میں بھی انسانی جذبات بہترین اسلوب پر کارفرما تھے۔ آپؐ بہت ہی صاحبِ احساس ہستی تھے اور خوشی میں خوشی اور غم میں غم سے متاثر ہوتے۔

حضورؐ ان نام نہاد بڑے لوگوں میں سے نہ تھے جو دنیا جہان کے غم میں گھلے جاتے ہیں لیکن گھر کے لیے سنگ دلی اور تغافل کیش ثابت ہوتے ہیں۔ باہر کی زندگی پُرہنگامہ ہوتی ہے۔

---

[1] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۴

گھر کی پھیکی اور بدمزہ۔ آپؐ کو ازواج کے ساتھ سچی محبت تھی۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ ایک ہی پیالہ میں پانی پیتے اور جہاں وہ مُنہ لگاتیں۔ وہیں منہ لگاتے۔ انصار کی بچیوں کو بلواتے تاکہ وہ ان کے ساتھ کھیلیں۔ حبشیوں کا ناٹک اس انداز سے دکھایا کہ حضرت عائشہ کی ٹھوڑی آپ کے کندھے پر تھی۔ بار بار پوچھتے کہ "کیا تم سیر ہوگئی ہو؟" وہ کہتیں "ابھی نہیں!" دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ حضرت صفیہ کو اونٹ پر سوار کرنے کے لیے آپؐ اپنا گھٹنا بڑھا دیتے اور اس پر آنجناب اپنا پیر رکھکر سوار ہو جاتیں۔ ایک مرتبہ سفر میں ناقہ کا پاؤں پھسلا اور حضورؐ اور جناب صفیہ دونوں گر پڑے۔ ابوطلحہ ساتھ تھے، دوڑے ہوئے آپؐ کے پاس آئے۔ آپؐ نے فرمایا پہلے خاتون کی طرف توجہ کرو۔ ایک بار ساربان نے اونٹوں کو تیز چلایا تو فرمانے لگے: "دیکھو، آبگینے ہیں آبگینے! ذرا احتیاط سے[۲]"۔ اسی محبت کی وجہ سے ایک بار شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی جس پر عتاب آیا کہ حلال شے کو حرام نہ کرو[۳]۔

اپنے بچوں کے لیے بھی حضورؐ کے جذبات بڑے گہرے تھے۔ حضرت ابراہیم کو رضاعت کے لیے ایک لوہار کے گھر میں مدینہ کے بالائی حصے میں رکھا گیا تھا۔ ان کو دیکھنے کے لیے خاصا فاصلہ چل کر تشریف لے جاتے۔ گھر میں دھواں بھرا ہوتا، مگر وہاں بیٹھتے اور بچے کو گود میں لے کر پیار کرتے[۴]۔

حضرت فاطمہؓ آتیں تو اٹھ کر استقبال کرتے۔ خود تشریف لے جاتے۔ اپنی کہتے، ان کی سنتے ان کے صاحبزادوں، امام حسن و امام حسین سے بہت ہی پیار تھا۔ ان کو گود میں لیتے۔ ان کو

---

۱ المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۶ ۔ ۲ مسلم و بخاری

۳ مغربی اہلِ قلم نے حضورؐ کی اس صاف ستھری ازدواجی زندگی کو مخالفت کا ہدف بنایا ہے، حالانکہ خود ان کے تمدن نے جو بلند ترین اور ذمہ دار ترین شخصیتیں پیدا کی ہیں وہ نہ صرف گھر کے دائرے میں رکاکت تک پہنچ جاتی ہیں بلکہ اس دائرے سے باہر بھی انہیں نفسانیت گھناؤنی پستیوں میں گرائی رکھتی ہے۔ حضورؐ کا حال یہ تھا کہ ساری دلچسپیاں دائرہ ازدواج تک محدود تھیں اور ان میں بھی رنگ پاکیزگی نمایاں تھا۔ آپؐ نے فطرت کے تقاضوں کو شائستگی کی حدود میں رہ کر باحسن طریق پورا کیا اور ازدواجی محبت کا ایک مہذب اسلوب پیدا کیا۔

۴ بروایت انسؓ۔

کندھوں پر سوار کرتے، ان کے لیے گھوڑا بنتے، حالتِ نماز میں بھی ان کو کندھوں پر بیٹھنے دیتے۔ ایک بار اقرع بن حابس نے آپؐ کو جناب حسنؓ کا بوسہ لیتے دیکھا تو تعجب سے کہا کہ میرے تو دس بیٹے ہیں، میں نے کبھی کسی کو پیار نہیں کیا مگر آپ بوسہ لیتے ہیں۔ فرمایا جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

اپنی ابراہیم صاحبزادے کی وفات ہوئی تو صدمہ سے آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اسی طرح ایک صاحبزادی کی وفات آپ کی موجودگی میں ہوئی۔ ام ایمن (کنیز) چلا چلا کر رونے لگیں۔ حضورؐ نے منع کیا تو وہ کہنے لگیں کہ آپؐ خود بھی تو رو رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ایسا رونا منع نہیں ہے۔ یہ رونا جس رقت کی وجہ سے ہے وہ اللہ کی ایک رحمت ہے۔ اپنی صاحبزادی ام کلثوم کی قبر پر کھڑے ہوئے تو اس وقت بھی آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ عثمان بن مظعون کی میت کے سامنے بھی آپؐ کی آنکھیں اشکبار تھیں اور آپؐ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اپنے رونے کی کیفیت کو خود یوں بیان فرمایا "آنکھیں اشک آلود ہیں، دل غم زدہ ہے۔ مگر ہم اپنی زبان سے اس کے ماسوا کچھ نہیں کہتے جو ہمارے رب کو پسند ہے۔" غم کی حالت میں اکثر زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے: حسبی اللہ نعم الوکیل۔ رونے میں اونچی آواز نہ نکلتی، بلکہ ٹھنڈا سانس لیتے اور ہانڈی کے ابلنے جیسی آواز سینے سے نکلتی۔[1]

یہ دلِ حساس جب اپنے خدا کے حضور میں عرض و نیاز کر رہا ہوتا یا قرآن وردِ زبان ہوتا تو ایسی حالت میں بھی بسا اوقات پلکوں پر موتی چمکنے لگتے۔ ایک بار عبداللہ ابن مسعود سے فرمائش کر کے قرآن سنا۔ وہ جب سورۂ نسا کی اس آیت پر پہنچے "فکیف اذا جئنا . . ." (اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ ہم امت میں سے ایک گواہ کو اٹھا کھڑا کریں گے اور ان لوگوں پر تمہیں گواہ بنا لائیں گے) تو آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو گیا۔[2]

یہ رقت سرچشمہ ہے ان جذباتِ ہمدردی و شفقت کا جو حضورؐ کو ساری انسانیت سے تھی اور خصوصاً اسلامی جماعت کے افراد سے! حیرت ہے کہ اس نزاکتِ احساس کے ساتھ حضورؐ نے مشکلات و مصائب کے مقابلے میں کس درجہ کے صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔

---

[1] شمائل ترمذی۔ باب ما جاء فی بکاء رسول اللہ صلعم [2] ایضاً

ذوقِ مزاح ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ رسولِ خدا خندہ روئی کی صفت سے متصف تھے۔ بلکہ فرمایا "وتبسمك فی وجه اخیك صدقة" (تیرا اپنے بھائی کے سامنے مسکراتے ہوئے آنا بھی ایک کارِ خیر ہے)۔ آپ کی یہ شان بھی بیان ہو چکی ہے کہ کان بسامًا ضاحکًا۔ عظیم کارنامے انجام دینے والی شخصیت کے لیے یہ ایک لازمی وصف ہے کہ وہ فرائضِ حیات کے بوجھ کو اپنے تبسّم سے گوارا بنا دے اور ساتھیوں کے دلوں میں گھر کرے۔ آپؐ کا حال یہ تھا کہ قد کان یباسط اصحابه، بما یولج حبّه فی القلوبؐ[1]؛ یعنی آپ ایسے بے تکلفانہ اندازِ مزاح سے پیش آتے تھے کہ رفقاء کے دلوں میں آپ کی محبت رچ بس گئی تھی۔ آپ ہنسی، دل لگی کی باتیں کرتے اور مجلس میں شگفتگی کی فضا پیدا کر دیتے۔ مگر توازن و اعتدال ہمیشہ ملحوظ رہتا۔ مزاح کا رنگ آٹے میں نمک کی طرح ہلکا رہتا اور اس میں بھی نہ تو خلافِ حق کبھی کوئی بات شامل ہوتی، نہ کسی کی دل آزاری کی جاتی اور نہ ٹھٹھے لگا کر ہنسنا معمول تھا۔ غنچوں کا سا تبسم ہوتا جس میں زیادہ سے زیادہ دانتوں کے کیلے دکھائی دیتے، حلق نظر نہ آتا۔

ایک بار تعجب سے حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ "آپ ہم سے مذاق بھی فرما لیتے ہیں؟" ارشاد فرمایا "ہاں، مگر میں خلافِ حق کوئی بات نہیں کہتا"۔

یہاں ہم حضورؐ پاک کے مزاح کے چند نمونے درج کرتے ہیں جو سنت کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں[2]۔

— کسی سائل نے سواری کا اونٹ مانگا۔ فرمایا: ہم تمہیں اونٹنی کا ایک بچہ دیں گے۔ سائل نے حیرت سے کہا کہ میں اسے لے کر کیا کروں گا۔ فرمایا: ہر ایک اونٹ کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے۔

— ایک بڑھیا نے آکر عرض کی کہ میرے لیے دعا کیجیے کہ خدا مجھے جنت عطا فرمائے۔ حضورؐ نے مزاحاً کہا "اے امّ فلاں! جنت میں کوئی بوڑھی عورت نہیں جا سکتی"۔ وہ روتی ہوئی اٹھ کر جانے لگی۔ حاضرین سے فرمایا! اسے کہو کہ خدا تعالیٰ اسے اس بڑھاپے کے ساتھ جنت میں نہیں لے جائے گا بلکہ اس کا ارشاد ہے کہ إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنشَاءً فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا عُرُبًا أَتْرَابًا۔ مراد یہ کہ جنت

---

[1] المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۷ [2] بیشتر واقعات شمائل ترمذی سے لیے گئے ہیں۔ باب ما جاء فی صفة مزاح رسول اللہ

ہیں جانے والیوں کو اللہ تعالیٰ جوانی سے سرفراز فرمائے گا۔

— زاہر (یا زہیر) نامی ایک بدوی تھے۔ ان سے بے تکلفی تھی۔ آپؐ اپنے اس بدوی دوست کو شہر سے متعلق کاموں میں امداد دیتے اور وہ دیہات سے متعلق حضورؐ کے کام کرلاتا نیز مخلصانہ جذبے سے ہدیے دیتا (جن کی قیمت حضورؐ باصرار ادا فرماتے)۔ چنانچہ فرماتے کہ زاہر دیہات میں ہمارا گماشتہ ہے اور ہم شہر میں اس کے گماشتہ ہیں۔ یہی زاہر ایک دن بازار میں اپنا کچھ سودا بیچ رہے تھے۔ حضورؐ نے پیچھے سے جاکر چپکے سے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور پوچھا بتاؤ میں کون ہوں۔ وہ پہلے تو کچھ نہ سمجھے، پھر جب معلوم ہوا تو فرطِ اشتیاق میں حضورؐ کے سینے سے اپنے کندھے ملتے رہے۔ پھر حضورؐ نے مزاحاً کہا کہ کون اس غلام کو خریدتا ہے۔ زاہر کہنے لگے، یارسول اللہ! مجھ جیسے ناکارہ غلام کو جو خریدے گا۔ گھاٹے میں رہے گا۔ فرمایا: تم خدا کی نگاہ میں ناکارہ نہیں ہو۔

— ایک موقع پر مجلس میں کھجوریں کھائی گئیں۔ آپؐ مزاح کے طور پر گٹھلیاں نکال نکال کر حضرت علیؓ کے آگے ڈالتے رہے۔ آخر میں گٹھلیوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرکے ان سے کہا کہ تم نے تو بہت کھجوریں کھائیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے گٹھلیوں سمیت نہیں کھائیں۔

— غزوۂ خندق کے موقع پر ایک واقعہ کی وجہ سے حضورؐ خوب ہنسے اور آپ کے دانت (نواجذ) تک دکھائی دیئے۔ ہوا یہ کہ عامر کے والد سعد تیر پھینک رہے تھے۔ ایک دشمن فرد زد پر تھا۔ وہ ڈھال بڑی پھرتی سے چہرے کے سامنے رکھ لیتا۔ سعد کے تیر کارگر نہیں بیٹھ رہے تھے۔ آخری بار سعد نے تیر کمان چڑھایا اور تاک میں رہے کہ موقع ملے تو چھوڑیں۔ اس نے جونہی ڈھال سے سر نکالا۔ تیر سیدھا پیشانی میں پیوست ہوگیا۔ اس بُری طرح چکرا کر گرا کہ ٹانگیں اوپر کو اُٹھ گئیں۔

بعد کے لوگوں کو اس رنگِ مزاح کا حال سُن کر تعجب ہوتا تھا، کیونکہ ایک تو مذہب کے ساتھ تقشف کا تصور ہمیشہ موجود رہا ہے اور خدا پرستوں اور متقیوں کی ہمیشہ رونی صورتیں اور خشک طبیعتیں لوگوں کے سامنے رہی ہیں، دوسرے حضورؐ کی عبادتِ رب، حضورؐ کی خشیت، حضورؐ کی بھاری ذمہ داریوں اور حضورؐ کے تفکرات کا خیال کرتے ہوئے یہ سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے کہ اس نمونہ

انسانیت نے ان مسکراہٹوں کے لیے زندگی کے نقشے میں کیسے جگہ پیدا کی۔ چنانچہ ابن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ "کیا رسول اللہ کے رفقا بھی ہنسا کرتے تھے؟" انہوں نے فرمایا: "ہاں، ہنستے تھے اور ان کے دلوں میں پہاڑ سے زیادہ بڑا ایمان تھا (یعنی ہنسی دل لگی ایمان و تقویٰ کی نقیض نہیں ہے) بتیروں کا نشانہ (بطور مشق) کرتے ہوئے دوڑتے تھے اور باہم دگر ہنستے تھے۔" (روایت قتادہ)

یہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ نماز صبح کے بعد مجلس رہتی اور اس میں جاہلی دور کی باتیں بھی چھڑتیں اور صحابہ کے ساتھ رسول اکرم بھی خوب ہنستے۔ بچوں سے آپؐ کے دل لگی کرنے کے واقعات بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں گھر میں ازواج کے ساتھ ہنسنے ہنسانے کا ذکر بھی گزر چکا ہے۔

تفریحات متوازن زندگی کا ایک لازمی جزء تفریحات (جائز حدود میں) بھی ہیں۔ مزاح کی طرح یہ جزء ساقط ہو جائے تو زندگی بوجھ بن جاتی ہے اور جس نظام حیات میں تفریحات کی گنجائش نہ رکھی گئی ہو اسے کوئی معاشرہ دیر تک اٹھا نہیں سکتا۔ حضورؐ کو بھی بعض تفریحات پسند تھیں اور جائز حدوں میں ان کے لیے راستے نکالے۔

شخصی طور پر آپؐ کو باغوں کی سیر کا شوق تھا۔ کبھی تنہا اور کبھی رفقا کے ساتھ باغوں میں چلے جاتے اور وہیں مجلس آرائی بھی ہو جاتی۔

تیرنے کا مشغلہ بھی تھا اور احباب کے ساتھ کبھی کبھار تالاب میں تیرا کرتے۔ دو دو ساتھیوں کے جوڑ بنائے جاتے اور پھر ہر جوڑ کے ساتھی دور سے تیر کر ایک دوسرے کی طرف آتے ایک موقع پر اپنا ساتھی حضورؐ نے جناب ابوبکر صدیقؓ کو پسند کیا۔

وقفے کے بعد بارش پڑتی تو تہ بند باندھ کر پھوار میں نہایا کرتے۔ کبھی تفریحاً کسی کنوئیں میں پاؤں لٹکا کے اس کے دہانے پر بیٹھتے[1]

دوڑوں اور تیر اندازی کے مقابلے کراتے اور اکھاڑے میں خود پوری دلچسپی سے شریک رہتے۔ ایسے موقعوں پر ہنسی بھی ہوتی۔

---

[1] شمائل ترمذی۔ مختلف ابواب۔

مسرت کے موقعوں پر پسند تھا کہ دف بجائی جائے یا بچیاں گیت گائیں۔ چنانچہ عید کی تقریب پر حضرت عائشہؓ کے پاس دو لڑکیاں گیت گا رہی تھیں۔ حضورؐ قریب ہی لیٹے تھے ابوبکر صدیقؓ آئے تو غصے میں ڈانٹا کہ خدا کے رسول کے گھر میں یہ کیا شیطانی ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ انہیں گانے دو۔[1]

شادی بیاہ کے لیے بھی فرمایا کہ ایسے موقعوں پر دف بجائی جائے (روایت عائشہ و محمد بن حاطب الجمحی)۔ حضرت عائشہ ہی بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس ایک انصاری لڑکی رہتی تھی۔ میں نے اس کا نکاح کر دیا تو حضورؐ نے فرمایا: "عائشہ تم گانے کا انتظام نہیں کراتیں۔ حالانکہ قبیلۂ انصار گانے کو پسند کرتا ہے۔" ایک دوسری روایت میں (غالباً اسی موقعے سے متعلق) یہ آتا ہے کہ "تم لوگ کسی گانے والے کو لڑکی کے ساتھ بھیجتے جو کہتا: "اَتَیْنَاکُمْ اَتَیْنَاکُمْ فحیّانا وحیّاکم" (ہم تمہارے پاس آئے، ہم تمہارے پاس آئے پس تم بھی سلامت رہو، ہم بھی سلامت رہیں) ایسی ہی ایک بزمِ عروسی میں بچیاں کچھ گا رہی تھیں۔ حضرت عامر بن سعد نے بعض حاضرین سے بطور اعتراض کہا کہ "اے صحابیانِ رسول! اے شرکائے بدر! تمہارے سامنے یہ کچھ ہو رہا ہے؟" جواب ملا "جی چاہے تو بیٹھ کر سنو ورنہ چلے جاؤ، ہمیں رسول اللہ نے اس کی اجازت دی ہے۔[2]"

ازاں جملہ حضورؐ نے شعر سے بھی دلچسپی لی ہے۔ عرب میں جو شعر پرستی رائج تھی اس سے تو آپ کو بُعد تھا۔ آپؐ کو نغمۂ الہام کی جاذبیتیں اتنا موقع ہی نہ دیتی تھیں کہ شعر و سخن کی طرف زیادہ توجہ ہو۔ مگر دوسری طرف ذوقِ شعر سے قدرت نے محروم نہیں رکھا۔ اچھے شعر (بلحاظ مقصد) کی قدر فرماتے تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ حضورؐ نے ایک نیا ذوق معاشرے کو دیا اور ایک نیا معیارِ نقد مقرر فرمایا۔ جابر بن سمرہؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ کی خدمت میں ایسی سَو سے زیادہ

---

[1] روایت عائشہ (مسلم) — باب مایقول الجواری فی العید

[2] ملاحظہ ہو: مشکوٰۃ باب اعلان نکاح۔

مجالس میں شریک ہوا ہوں جن میں جاہلیت کے قصے بھی ہوتے تھے اور صحابہ شعر بھی سنایا کرتے۔ شاعرانِ عرب کے کلام میں سے ایک بار لبید کا یہ مصرع پسندیدگی سے پڑھا: "اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰہُ بَاطِلٌ" (آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے سوا ہر چیز فانی ہے ۔ دوسرا مصرعہ ہے: وَ کُلُّ نَعِیْمٍ لَا مُحَالَۃَ زَائِلٌ۔ دنیا کی ساری نعمتیں زائل ہو جانے والی ہیں)۔ حضرت شرید سے ایک سفر میں یکے بعد دیگرے فرمائش کر کر کے امیہ ابن ابی صلت کے سو شعر سنے۔ آخر میں فرمایا کہ یہ شخص اسلام لانے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ بعض اوقات خود بھی (خصوصاً میدانِ جنگ میں) بلا ارادہ شعر کے انداز پر کلمات فرمائے ہیں۔ حضرت حسان اور کعب بن مالک سے دشمنانِ اسلام کے ہجویہ اشعار کے جواب میں شعر کہلاتے اور کبھی کبھی حضرت حسان کو اپنے منبر پر بٹھا کر ان سے پڑھواتے اور کہتے کہ "یہ اشعار دشمنوں کے حق میں تیر سے زیادہ سخت ہیں"۔ یہ بھی فرمایا کہ مومن تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی۔ شعر و ادب، نیز دوسرے ثقافتی موضوعات پر ہم تفصیل سے ایک علیحدہ مقالے میں بحث کر کے دکھانا چاہتے ہیں کہ حضورؐ نے انسانی ذوق کو کس تعمیری راستے پر ڈالا تھا۔

چند متفرق ذوقیات آخر میں ہم بعض ایسے خاص ذوقیات و اطوار کا ذکر کرتے ہیں جنہیں کسی دوسرے عنوان کے تحت نہیں لیا جا سکا۔

— کسی سے چیز لیتے تو سیدھے ہاتھ سے لیتے اور کوئی چیز دیتے تو سیدھے ہاتھ سے دیتے۔

— خطوط لکھواتے تو سب سے پہلے بسم اللہ لکھواتے۔ پھر مرسل کا نام اور اس کے نیچے مرسل الیہ کا نام ہوتا۔ اس کے بعد اصل مضمون لکھا جاتا۔ خاتمے پر مہر لگواتے۔

— حضورؐ اوہام پسندی سے پاک تھے اور شگون نہ لیتے تھے۔ البتہ اشخاص اور مقامات کے اچھے نام پسند آتے۔ برے نام پسند نہ کرتے۔ سفر میں اقامت کے لیے ایسا ہی مقام انتخاب کرتے جس کے نام میں خوشی یا برکت یا کامیابی کا مفہوم ہوتا۔ اسی طرح جس شخص کے نام میں لڑائی جھگڑے یا نقصان کا معنیٰ شامل ہوتا اسے کام نہ سونپتے۔ ایسے آدمیوں کو نامزد کرتے جن کے

ناموں میں خوشی یا کامیابی کا مفہوم پایا جائے۔ بہت سے ناموں کو تبدیل بھی فرمایا۔

— سواریوں میں سے گھوڑا بہت پسند تھا۔ فرماتے گھوڑے کے ایال میں قیامت تک کے لیے خیر و برکت ہے۔ گھوڑے کی آنکھ، منہ، ناک کو اہتمام سے اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے۔

— شور، ہنگامہ اور ہڑبونگ اچھی نہ لگتی۔ ہر کام میں سکون و وقار اور نظم و ترتیب چاہتے۔ نماز تک کے بارے میں کہا کہ بھاگم بھاگ نہ آؤ۔ "علیکم بالسکینۃ" (تمہارے لیے سکون و وقار لازم ہے)۔ یوم عرفہ کو ہجوم تھا اور بڑا شور و ہنگامہ تھا۔ لوگوں کو اپنے تازیانہ سے اشارہ کرتے ہوئے نظم و سکون کا حکم دیا اور فرمایا "فان البر لیس بالایضاع" (جلدی مچانے کا نام نیکی نہیں ہے)[1]۔

<u>اخلاق</u> حضورؐ پاک کے اخلاق کا بیان یہاں کسی ضمنی عنوان کے تحت کیا نہیں جا سکتا۔ وہاں تو پوری زندگی حُسنِ خلق ہی کی تفسیر ہے جس کے متعلق حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا "کان خلقہ القرآن"۔ انس بن مالک کا یہ قول بہت ہی جامع ہے کہ: کان احسن الناس وکان اجود الناس وکان اشجع الناس[2]"۔ احسن الناس ہونے کی کیفیت یہ تھی کہ کسی کو عمر بھر تکلیف نہیں پہنچائی (ماسوا ان باتوں کے جو حکم الٰہی کے تحت تھیں)، اور دوسروں کی زیادتیوں پر کبھی انتقام نہیں لیا۔ ہر کسی سے عفو فرمایا، یہاں تک کہ مکہ اور طائف کے بدترین دشمنوں کو معاف کیا اور منافقین اشرار سے درگزر کیا۔ اجود الناس ہونے کا عالم یہ تھا کہ جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ سے جو کچھ بھی کسی نے مانگا، آپ نے کبھی نہ نہیں کی[3] (موجود ہوا تو دے دیا، کبھی قرض لے کر دیا، نہیں موجود ہوا تو دوسرے وقت آنے کو کہا، یا سکوت اختیار کیا)۔ اشجع الناس ہونے کے لیے فی الجملہ یہ امر کافی ہے کہ نظریۂ حق کو لے کر تن تنہا اٹھے اور زمانے بھر کی مخالفتوں اور مظالم کے مقابلے میں جمے کھڑے رہے، کبھی کسی خطرناک ترین موقع پر بھی خوف یا کمزوری کا اظہار نہ کیا۔ غارِ ثور ہو یا احد و حنین کے معرکے، ہر موقع پر یقینِ محکم کا مظاہرہ کیا۔

---

[1] بخاری و مسلم [2] مسلم باب فی شجاعۃ النبی صلعم [3] باب ما سُئل النبی صلعم ... الخ۔

معیارِ انسانیت ان چند اشارات کے ذریعے سرورِ عالم کی عظیم المرتبت شخصیت کا ایک اجمالی خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اس خاکے کو سامنے رکھیے، اس کے توازن اور اس کی جامعیت کو دیکھیے، پھر غور کیجیے کہ اس خاکے میں کیسا رنگ بھرا جا سکتا ہے اور وہ کیا رنگ ہیں جو اس کے ساتھ نسبت نہیں پا سکتے۔ اس کی شخصیت میں کیسا ایمان ہونا چاہیے، کیسا کردار ہونا چاہیے، کیسے کارناموں کی اس سے توقع کی جانی چاہیے، اس کا کیا درجہ محفلِ انسانیت اور بزمِ خلائق میں ہو سکتا ہے۔ اس کا پیغام کس شان کا پیغام ہوگا، اس کے تشکیل دیئے ہوئے انسان کس طرز کے انسان ہوں گے، اس کا برپا کردہ تمدن کس نوعیت کا تمدن ہوگا۔ دیکھو کہ اس خاکے میں کوئی پہلو ساقط نہیں، کوئی افراط و تفریط نہیں، کوئی خط کج نہیں ہوتا۔ کوئی نقطہ بدنما نہیں، کوئی شوشہ بے معنی نہیں۔ یہاں گہری فکر ہے تو ساتھ ہی جوشِ عمل کارفرما ہے۔ سنجیدگی و وقار ہے تو اس کے ساتھ لطافت و مزاح بھی ہے۔ پرداخت اجتماعیت ہے تو ساتھ ہی گھریلو زندگی کا نکھار بھی ہے۔ سیاست ہے تو اس میں روحانیت و اخلاق کا رنگ بھی شامل ہے۔ زہد و تقویٰ ہے تو اس کے ساتھ انتظامِ دنیا کی تدبیریں بھی ہیں۔ فقر و فاقہ ہے تو اس کے ساتھ ذوقِ اعلیٰ بھی موجود ہے۔ انتہائی تحمل و برداشت ہے تو اس کے ساتھ ظلم کے استیصال کے لیے بازوئے شمشیر زن بھی ہے۔

اس ہستی کے چہرے کو دیکھو، اس کے لباس کو دیکھو، اس کی نشست و برخاست کا جائزہ لو، اس کے احباب اور اس کی مجالس کا رنگ دیکھو، اس کے لمحاتِ مسرت اور ساعاتِ غم پر نگاہ ڈالو، اس کے آداب و اطوار کو پرکھو — اور پھر بتاؤ کہ یہ شخصیت معیارِ انسانیت ہے یا نہیں۔

سوچو کہ اس خاکے پر مبنی شخصیت کے بارے میں جن لوگوں نے تعصب زدہ ذہن سے بُری باتیں سوچیں اور لکھیں، انہوں نے عین روحِ انصاف کے ساتھ کتنا ظلم کیا اور خود اپنے آپ کو کس نعمت سے محروم رکھا۔

دین میں مصلحت و ضرورت کا لحاظ

افادات ابن قیم

ترجمہ و ترتیب: خلیل حامدی

[یہ مقالہ علامہ ابن قیم کی مشہور کتاب "اعلام الموقعین" کا ایک باب ہے۔ اس میں انہوں نے شریعت کے اس قاعدے پر بحث کی ہے کہ زمان و مکان اور حالات و عادات کے تغیر سے احکام شریعت کی تبدیلی کن مصالح اور شرائط کے تحت رونما ہوتی ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور ائمہ مجتہدین سے ہمیں اس بارے میں کیا رہنمائی ملتی ہے۔ یہ بحث علامہؒ نے بڑی تفصیل و وضاحت اور مثالوں کی روشنی میں بیان کی ہے۔ لیکن ہم نے طوالتِ کلام سے بچتے ہوئے زیر نظر مقالہ میں صرف ان حصوں کو لیا ہے جو اس مسئلہ سے براہِ راست متعلق ہیں۔ ضمنی جزئیات اور فقہی تفصیلات سے حتی الامکان تعرض نہیں کیا۔ جو صاحب امام رحمہ اللہ کی پوری بحث کو جو نو فصلوں پر مشتمل ہے معلوم کرنا چاہتے ہوں، وہ اعلام الموقعین ج ۳ ص ۱ پر اسے پڑھ لیں ——— مرتب]

"زمان و مکان کے تغیر، حالات و نیات کے اختلاف اور عُرف و عادت کی تبدیلی سے فتویٰ بدل جاتا ہے۔" فتویٰ میں تبدیلی کا یہ بڑا اہم اصول ہے۔ جو لوگ اس کی حقیقت کو نہیں جانتے وہ شریعتِ اسلامی کے بارے میں زبردست غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں، جن کی وجہ سے شریعت کے اندر تنگی، مشقت اور تکلیف مالایطاق کی ایسی صورتیں فرض کر لی گئی ہیں جن کے بارے میں صاف معلوم ہے کہ شریعت بیضا ——— جو انسانی مصالح کا پورا پورا لحاظ کرتی ہے۔

ان کی روا داری نہیں ہے، کیونکہ شریعت کی بنیاد حکمت اور بندوں کے دنیوی و اخروی مصالح پر رکھی گئی ہے۔ بلکہ شریعت تو مجسم عدل و مساوات، یکسر رحم و ہمدردی اور سراسر مصلحت و حکمت ہے۔ اس لیے ہر وہ مسئلہ جو انصاف کے بجائے ظلم و زیادتی کا، سہولت کے بجائے مشقّت کا، مصلحت کے بجائے مفسدت کا اور حکمت کے بجائے لغویّت کا سبب بن جائے وہ ہرگز شریعت کا مسئلہ نہیں ہو سکتا خواہ تاویل و توجیہ کے ذریعے اُسے نظامِ شریعت میں زبردستی ٹھونس دیا جائے۔ دراصل شریعت نام ہے انسانوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کی عدل گستری کا، مخلوق پر اس کی رحمت و مہربانی کا، روئے زمین پر اس کے سایۂ کرم کا۔ بلکہ شریعت عبارت ہے اُس حکمتِ الٰہی اور تدبیرِ خداوندی سے، جس کی جلوہ نمائیاں اُس کی ہستی کی مکمل شہادت اور اس کے رسولوں کی صداقت کا محکم ثبوت فراہم کر رہی ہیں —— یہ وہ خدائی نور ہے کہ اسی سے اربابِ بصیرت نے روشنی حاصل کی، یہ وہ ربّانی قندیل ہے کہ جویانِ حق اسی کی بدولت راہ یاب ہوئے، یہ وہ نسخۂ شفائے کامل ہے کہ اسی کے فیض سے ہر درد مند نے دوا پائی۔ یہ وہ صراطِ مستقیم ہے کہ جو اس پر گامزن ہوا وہ راہِ اعتدال سے ہمکنار ہوا۔ شریعت آنکھوں کے لیے ٹھنڈک، دلوں کے لیے زندگی اور روحوں کے وجہِ مسرت ہے۔ حیات و حرکت، عصمت و حفاظت، غذا و دوا اور نور و شفا کا وجود اسی کا مرہونِ منت ہے۔ کائنات کی ہر خوبی اسی سے ماخوذ و مستفاد ہے اور ہر خرابی اسی کے ضیاع کا نتیجہ ہے۔ اگر شریعتِ الٰہی کے یہ بچے کھچے نشانات بھی نہ ہوتے تو لامحالہ دنیا کا بازار اُجڑ چکا ہوتا اور بساطِ عالم لپٹ چکی ہوتی، چونکہ نوعِ بشری کا تحفظ اور کائنات کا نظم شریعت کے وجود سے وابستہ ہے اور شریعت ہی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے زمینوں اور آسمانوں کو زائل ہونے سے تھام رکھا ہے، اس لیے جب مشیتِ ایزدی خراب آبادِ عالم کی بساط لپیٹنے کا فیصلہ کرے گی تو شریعت کے یہ باقیماندہ نقوش بھی محو کر دیئے جائیں گے۔

پس وہ شریعت جس کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ہیں، کائنات کی حیات، فلاح کا مدار اور معاش و معاد کی سعادت کا مرکز ہے۔

اب ہم ذیل میں اللہ کی تائید و نصرت سے تغیر احکام کے اصول کو چند صحیح مثالوں سے تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

منکر کو مٹانے میں حالات کا لحاظ: انکارِ منکر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے لیے شریعت حقہ کے نہایت اہم واجبات میں سے قرار دیا ہے تاکہ منکر کے ازالے سے وہ معروف حاصل ہو جس کو اللہ اور اس کا رسول پسند کرتے ہیں، لیکن اگر کسی منکر کی مخالفت اس سے عظیم تر اور خدا و رسول کے نزدیک مبغوض تر منکر برپا کر دینے کا موجب بنتی ہو تو اس سے تعرض کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگرچہ اس کا وجود بھی، بجائے خود اللہ کو ناپسند ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والے غضب الٰہی کو دعوت دیتے ہیں۔ مثلاً امراء و سلاطین کے اندر فسق و فجور دیکھ کر ان کے خلاف خروج کر لینا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ چیز تمام فتنوں کی جڑ ہے اور اس سے قیامت تک کے لیے شرّ و فساد کا دروازہ کھل جائے گا چنانچہ جب صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے حکمرانوں کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت طلب کی جو نماز کو وقت پر ادا نہ کریں تو آپ نے اس سے روکا اور فرمایا: "لَا، مَا أَقَامُوا الصَّلٰوةَ" (نہیں، جب تک وہ نماز قائم کرتے رہیں)۔ نیز آپ نے فرمایا:

من رأى من اميره ما يكرهه فليصبر ولا ينزعن يدا من طاعته	جو شخص اپنے امیر کے اندر کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے تو وہ صبر سے کام لے اور اس کی اطاعت سے دست کش نہ ہو۔

چنانچہ اسلامی تاریخ میں برپا ہونے والے فتنوں اور مسلمانوں کی باہمی آویزشوں کے دوران اسلام پر جو کچھ بیتی ہے جو شخص اس کا بنظر غائر مطالعہ کرے گا اُسے معلوم ہو گا کہ اس کا اصل سبب یہی تھا کہ مذکورۂ بالا اصول کو نظر انداز کر دیا گیا اور منکر کو برداشت نہ کیا جا سکا بلکہ اُس کی بیخ کنی کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ کوشش مزید فتنہ و فساد رونما کر دینے اور سابق سے بھی قبیح تر منکر کو جنم دینے پر منتج ہوئی۔ مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے منکرات کا ارتکاب ہوتا تھا مگر آپ اُن کو مٹانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے اس لیے خاموش رہتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ

جب یہ تائید ایزدی مکہ زیر نگیں ہو گیا اور دارالاسلام بن گیا تو آپ نے عمارت کعبہ میں تغیر و تبدل کر کے اسے بنائے ابراہیمی پر قائم کرنے کا عزم کر لیا۔ لیکن پھر آپ قدرت و استطاعت کے باوجود صرف اس اندیشے کی بنا پر رک گئے کہ قریش جو نئے نئے کفر سے نکل کر اسلام کے دامن میں آئے ہیں اس تبدیلی کو برداشت نہیں کریں گے۔ اور نتیجہ یہ ہو گا کہ جو خرابی اب موجود ہے اس کی نسبت بڑی خرابی رونما ہو جائے گی۔ اسی اصول کے تحت آپ نے فاسق و ظالم امراء کے مقابلے میں تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں کیونکہ اس سے ایسی خرابیاں واقع ہونے کا اندیشہ ہے جو ان کے شر سے عظیم تر ہوں۔

انکارِ منکر کی چار صورتیں انکارِ منکر کے چار درجے ہیں:

۱۔ منکر کو زائل کر کے، اس کی جگہ معروف کو قائم کر دیا جائے۔
۲۔ منکر کو بالکلیہ زائل نہ کیا جا سکے تاہم اس کی شدت میں کمی کر دی جائے۔
۳۔ ایک منکر کو مٹایا جائے اور اسی پیمانے کا دوسرا منکر برپا ہو جائے۔
۴۔ منکر کو مٹانے کے نتیجے میں اس سے بدتر اور خطرناک تر منکر اٹھ کھڑا ہو۔

پہلے دو درجوں میں نہی عن المنکر کا فرض سرانجام دینا عین تقاضائے شریعت ہے تیسرا درجہ محلِ اجتہاد ہے (یعنی اس میں غور و فکر کے بعد کوئی سا پہلو اختیار کیا جا سکتا ہے) لیکن چوتھے درجہ میں منکر سے تعرض کرنا حرام ہے۔ چنانچہ تم اگر اوباش لوگوں کو شطرنج بازی میں مگن پاؤ تو تم اگر انہیں شطرنج سے روک کر کسی ایسے کھیل میں لگا سکو جو خدا و رسول نے پسند کیا ہو۔ مثلاً تیر اندازی یا اسپ دوانی وغیرہ تو فبہا ورنہ یونہی ان پر تمہارا نکیر کرنا بصیرت و تفقہ کے دیوالیہ پن کی علامت ہو گی۔ اسی طرح ایک جگہ تم دیکھتے ہو کہ فسّاق و فجار کا مجمع ہے، دادِ لہو و لعب دی جا رہی ہے یا رقص و سرود کی محفل جمی ہوئی ہے تو اگر تم کسی تدبیر سے انہیں اللہ کی اطاعت و عبادت کی جانب منتقل کر سکو تو یہ عین مقصود و مطلوب ہے اور اگر یہ نہ کیا جا سکے تو ان کو اپنے حال میں مست رہنے دینا اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں وسیع تر فتنہ پردازی کے لیے فارغ کر دو،

حالانکہ جس چیز میں وہ اب مستغرق ہیں وہ انہیں اس فتنہ پردازی سے غافل کیے ہوئے ہے۔ ایسے ہی اگر ایک شخص محض قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھنے میں منہمک ہے۔ اگر اُسے ایسی چیزوں کے مطالعہ سے منع کرنے کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ بدعات وضلالات اور طلسم وجادو کی کتابوں کی طرف رجوع کرنے گا تو اُسے پہلی نوعیت کی کتابوں ہی میں مشغول رہنے دیا جائے۔ الغرض اس طرح کی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ قدس اللہ روحہ فرماتے تھے کہ فتنۂ تاتار کے زمانہ میں ہمارا گزر ایک گروہ پر ہوا جو شراب وکباب میں مشغول تھا۔ میرے ایک ساتھی نے ان لوگوں کو شراب نوشی سے منع کرنا چاہا مگر میں نے اسے ٹوکا کہ بندۂ خدا شراب اللہ کے ذکر سے اور نماز سے روکتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُسے حرام کر دیا ہے اور یہاں حال یہ ہے کہ شراب ان ظالموں کو بڑے فتنے یعنی قتل نفوس، سلب اموال اور عورتوں اور بچوں پر دست درازی سے روکے ہوئے ہے۔ لہٰذا ان کو ان کے حال ہی پر چھوڑ دیا جائے۔

قطع ید کے حکم میں مصلحت کا لحاظ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے موقع پر چوروں کے ہاتھ کاٹنے سے منع فرمایا ہے (ابو داؤد)۔ ملاحظہ کیجیے قطع ید اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدوں میں سے ایک حد ہے لیکن چونکہ جنگ کے دوران اقامتِ حد میں اندیشہ ہے کہ مجرم حمیتِ شیطانی اور جوشِ نفسانی سے مغلوب ہو کر کفار ومشرکین سے جا ملے گا اور یہ بات خدا کے نزدیک حدود کے معطل یا مؤخر ہو جانے سے زیادہ مبغوض ہے۔ اس لیے شارع علیہ السلام نے جنگ کے دوران اُسے نافذ کرنے کی ممانعت فرما دی، جیسا کہ حضرت عمر، ابو الدرداء اور حذیفہ وغیرہم نے فرمایا ہے۔ اس بنا پر ائمہ اسلام میں سے احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، امام اوزاعی اور دوسرے حضرات نے یہ اصول اختیار کیا ہے کہ اِنَّ الْحُدُوْدَ لَاتُقَامُ فِیْ اَرْضِ الْعَدُوِّ (دشمن کی سرزمین میں حدود اللہ جاری نہ کی جائیں)۔ ابو القاسم خرقی نے بھی اپنے "مختصر" میں اس اصول کو بیان کیا ہے لیکن ان کے الفاظ یہ ہیں، لَا یُقَامُ الْحَدُّ عَلٰی مُسْلِمٍ فِیْ اَرْضِ الْعَدُوِّ (دشمنوں کے علاقہ میں کسی مسلمان پر حد جاری نہیں کی جائے گی)۔

ایک بار جنگ کے موقع پر ایک فوجی نے بشر بن ارطاۃ کی ڈھال چرالی۔ اُسے جب گرفتار کر کے بُشر کے سامنے لایا گیا تو انہوں نے فرمایا:

لولا انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: لا تقطع الایدی فی الغزو۔ لقطعت یدک (ابوداؤد)	اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے نہ سنا ہوتا کہ "دوران جنگ میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں" تو میں ضرور تیرا ہاتھ کاٹ دیتا۔

ابو محمد المقدسی کہتے ہیں کہ وھو اجماع الصحابہ (اس اصول پر تمام صحابہ کا اجماع ہے) سعید بن منصور نے اپنے سنن میں احوص بن حکیم کی سند سے روایت کیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے افواج کے نام فرمان جاری کیا تھا کہ:

لا یجلدن امیر جیش ولا سریۃ ولا رجل من المسلمین وھو غاز حتی یقطع الدرب قافلا لئلا تلحقہ حمیۃ الشیطان فیلحق بالکفار۔	کسی سپہ سالار، کسی سردار دستہ یا کسی مسلمان شخص پر حالت جنگ میں حد نہ جاری کی جائے تا وقتیکہ وہ سرحدوں کو عبور کر کے اپنے علاقے میں نہ آجائے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پر حمیت شیطانی کا غلبہ ہو جائے اور وہ کفار سے جا ملے۔

حضرت ابوالدرداء سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ علقمہ کا بیان ہے کہ ہم ایک لشکر میں تھے جو روم پر حملہ آور تھا۔ حذیفہ ابن یمان بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ولید بن عقبہ ہمارے سردار تھے انہوں نے وہاں شراب پی لی۔ ہم نے اُن پر حد جاری کرنا چاہی مگر حذیفہ نے روک دیا اور کہا: کیا تم اس حال میں اپنے امیر پر حد جاری کرنا چاہتے ہو جب کہ دشمن تمہارے سامنے ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم پر دشمن کا حوصلہ بڑھ جائے گا۔"

جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص کے پاس ابو محجن ثقفی بجرم بادہ خواری میں گرفتار ہو کر آئے۔ حضرت سعد نے انہیں قید کر دیا۔ جب معرکۂ کارزار گرم ہوا تو ابو محجن نے اسلامی فوج کے حالات دیکھ کر کہا:

كفى حزنا ان تطرد الخيل بالقنا　　　واترك مشدودا علي وثاقيا

(ڈر سے رنج کی بات ہے کہ دشمن کے نیزے ہمارے گھوڑوں کو پیچھے پھینکتے رہیں
اور میں یہاں زنجیروں میں جکڑا ہوا پڑا رہوں)

آخر کار ابو محجن نے حضرت سعدؓ کی بیوی سے درخواست کی کہ آپ مجھے کھول دیں، اگر خدا نے مجھے رکھ لیا تو واپس آکر یہ زنجیریں پاؤں میں ڈال لوں گا اور اگر مارا گیا تو جھگڑا ہی چکتا ہو جائے گا۔ حضرت سعدؓ کی بیوی نے اُن کے بند کھول دیے۔ انہوں نے حضرت سعد ہی کا گھوڑا لیا (جو اتفاق سے فارغ تھا کیونکہ حضرت سعد اس روز ایک زخم کی تکلیف کی وجہ سے قتال کے لیے نہ نکل سکے تھے) اور لشکر کفار پر حملہ بول دیا اور اس قدر دادِ شجاعت دی کہ جس سمت ٹوٹ پڑتے تھے صفیں پلٹ دیتے تھے۔ ان کے حیرت انگیز کارنامے کو دیکھ کر لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ شاید یہ کوئی فرشتہ آسمان سے مدد کے لیے اتر آیا ہے۔ حضرت سعد بھی ان کی یہ بہادری عذیب نامی مقام پر کھڑے دیکھ رہے تھے اور داد تحسین دے رہے تھے۔ آخر کار ابو محجن نے دشمن کو پسپا کر دیا اور واپس آکر حسب وعدہ بیڑیاں پہن لیں۔ حضرت سعد کی بیوی نے اُن کے سامنے یہ سارا قصہ بیان کیا۔ حضرت سعدؓ نے یہ سُن کر فرمایا: خدا کی قسم! میں ایسے شخص کو ہرگز سزا نہ دوں گا جس نے مسلمانوں کی خاطر اس قدر جان نثاری دکھائی ہے۔" ابو محجن نے اس فیصلے سے متاثر ہو کر کہا: "جب مجھے کوڑے مار کر پاک کیا جاتا تھا تو میں برابر شراب پیتا رہا۔ اب جب آپ نے میری حد رائگاں قرار دے دی ہے (یعنی ساقط کر دی ہے) تو خدا کی قسم! میں آئندہ اس بلا کو منہ نہیں لگاؤں گا"

اس میں کوئی بات نص یا قیاس یا اصولِ شریعت میں سے کسی اصل کے خلاف نہیں ہے، نہ اجماع کے مخالف ہے۔ بلکہ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اسی پر صحابہ کا اجماع ہے تو زیادہ درست ہوگا۔ چنانچہ شیخ ابن قدامہ اپنی کتاب المغنی میں رقمطراز ہیں: هذا اتفاق لم يظهر خلافه (یہ متفق علیہ ہے اس سے کسی کا اختلاف ظاہر نہیں ہوا)۔

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد امام ابن قیم تاخیر حد کی ضرورت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: میرے نزدیک اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقامت حد میں یہ تاخیر دو میں سے کسی ایک مصلحت کی بنا پر کی جا سکتی ہے۔ ایک یہ کہ خود مسلمانوں کو ایک جنگ آزما سپاہی کی ضرورت ہو اور دوسرے یہ کہ مجرم کے مرتد ہو جانے اور کفار سے مل جانے کا کھٹکا ہو۔ عوارض کی بنا پر حد کو مؤخر کر دینے کی تصریح خود شریعت میں وارد ہے۔ مثلاً حاملہ عورت کی یا جس کا بچہ دودھ پیتا ہو، اس کی حد ملتوی کر دی جاتی ہے۔ مریض پر حالت مرض میں حد جاری کرنا ممنوع ہے۔ سخت گرمی اور سخت سردی کے وقت بھی حد نافذ کرنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اگر شریعت میں مجرم (ایک فرد) کے مصالح کو ملحوظ رکھ کر حد مؤخر کی جا سکتی ہے تو ظاہر ہے کہ مصلحت دین کی خاطر اس کو مؤخر کرنا بدرجۂ اولیٰ جائز ہونا چاہیے۔

سعد بن ابی وقاص نے ابو محجن کے ساتھ جو معاملہ کیا اس سے یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت سعد نے ابو محجن سے حد ملتوی نہیں کی بلکہ منسوخ ہی کر دی تھی۔ تو کیا حد منسوخ کر دینا جائز ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو ہمارے لیے حضرت سعد کا یہ عمل قابل حجت نہیں ہے (کہ اس سے تنسیخ حد کا اصول قائم کر لیا جائے) اور ثانیاً یہ کہ جو لوگ حضرت سعد کے قول سے تمسک رکھتے ہیں وہ بھی اس سے صرف یہ استنباط کرتے ہیں کہ دارالحرب میں مسلمان پر حد واجب نہیں ہے جیسا کہ امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعدؓ نے اس معاملہ میں سنت اللہ کی پیروی کی ہے۔ چنانچہ حضرت سعد نے جب ابو محجن کے اندر دین کی غیر معمولی تاثیر جہاد کا جذبہ اور جاں افشردگی کا شوق موجزن دیکھا تو ان کی حد کو درگزر کر دیا۔ اس لیے کہ ابو محجن سے جن نیکیوں کا صدور ہوا وہ ان کی ایک بدی پر چھا گئیں اور اس کی مثال اس قطرۂ نجاست کی سی ہو گئی جو سمندر میں تحلیل ہو گیا ہو۔ علاوہ ازیں عین میدان کارزار میں حضرت سعد نے بچشم خود ابو محجن کی سچی توبہ کے آثار دیکھ لیے یہ وہ وقت تھا جب کہ کسی مسلمان کے متعلق یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایسے کڑے وقت میں بھی جب کہ موت سامنے دیکھ رہا ہو اور ہر لمحہ دربار الٰہی

میں حاضری کا گمان ہو، اپنے گناہ پر اصرار کرے گا۔ اس پر مستزاد یہ کہ انہوں نے خود اپنے آپ کو حوالے کر کے اور اپنے پاؤں میں برضائے خود بیڑیاں ڈال کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ فی الواقع اس بات کے مستحق ہیں کہ اُن کی سزا کو عفو کے آبِ زلال سے دھو دیا جائے۔"

اجرائے احکام میں حکمت نبوی کے نقائص | یہ تبصرہ کرنے کے بعد امام موصوفؒ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی چند نظیریں نقل کی ہیں۔ جن سے اس قسم کی رعایت ثابت ہے۔

۱۔ ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ، میں حد کا مستحق ہو گیا ہوں، مجھ پر حد جاری فرمایئے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: "کیا تم نے ابھی ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے۔" اس نے عرض کیا "جی ہاں"۔ فرمایا: "جا اللہ نے تیرا قصور معاف کر دیا۔" اس درگزر اور دفعِ حد کی برکت اس طرح ظاہر ہوئی کہ اُس نے صدق دل سے توبہ کر لی اور وہیں اعلان کر دیا "خدا کی قسم میں آئندہ ہرگز (اور دوسری روایت میں ہے "ابد الآباد تک") شراب نہیں پیوں گا۔" ایک اور روایت میں ہے، اُس نے کہا، "تمہارے کوڑوں کی وجہ سے میں شراب ترک کر دینا اپنی شان کے منافی سمجھتا تھا۔ جب تم نے مجھ کو چھوڑ دیا ہے تو خدا کی قسم! میں آئندہ اس ملعون کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔"

۲۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے قبیلہ بنی جذیمہ کے ساتھ جو نامناسب کارروائی کی تھی اس کا علم جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا تو آپ نے صرف اتنا فرمایا: اللھم انی ابرأ الیک مما صنع خالد (اے اللہ! جس فعل کا ارتکاب خالد نے کیا ہے میں تیرے حضور اس سے اظہارِ براءت کرتا ہوں) اس سے زیادہ جناب رسالتمآب نے حضرت خالدؓ کی عمدہ صلاحیتوں، خدماتِ جلیلہ اور نصرتِ اسلام کا پاس کرتے ہوئے ان پر کسی قسم کی گرفت نہیں فرمائی۔ بہر حال یہ اصول بڑی اہمیت و افادیت کا حامل ہے اور اس کے فلسفہ و رموز تک صرف وہی رسائی حاصل کر سکتا ہے جو امر و نہی اور ثواب و عقاب کے باہمی ربط و تعلق کا گہرا مطالعہ کرے گا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ تائب کو عذاب نہیں دیتا اسی طرح تائب پر حد بھی نہیں قائم کی جاتی۔ چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے واضح حکم کے ذریعے ان محاربین اور مفسدین پر سے حد ساقط کر دی ہے جو مسلمانوں کے قابو

میں آنے سے پہلے توبہ کر لیں۔ اس حکم میں یہ تنبیہ مضمر ہے کہ جب اس قدر سنگین جُرم کی سزا توبہ و رجوع الی اللہ سے معاف ہو سکتی ہے تو محاربہ و فساد سے کم تر جُرم کی سزا توبہ و انابت سے بدرجۂ اولیٰ معاف ہونی چاہیے۔

۳۔ نسائی کی ایک روایت میں مذکور ہے کہ ایک عورت اندھیرے مُنہ صبح کی نماز کے لیے مسجد کی طرف نکلی۔ راستے میں ایک شخص نے اُس پر ہاتھ ڈالا اور اس کی عصمت دری کرنے لگا۔ عورت نے شور مچانا شروع کر دیا اور پاس سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو مدد کے لیے پکارا۔ وہ شخص جب آیا تو مجرم بھاگ گیا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑا۔ اتنے میں کچھ اور لوگ گزرے۔ عورت نے ان سے بھی فریاد کی۔ وہ بھی فوراً مجرم کی تلاش میں دوڑے۔ مجرم تو کہیں آگے نکل گیا اور انہوں نے اُسی شخص کو جا لیا جو خود عورت کی مدد کو نکلا تھا۔ اُس کو پکڑ کر عورت کے پاس لے آئے۔ اُس نے کہا مَیں تو اس کی مدد کو لپکا تھا۔ جس شخص نے اس پر دست درازی کی ہے وہ بھاگ گیا ہے۔ مگر کسی نے اُس کی نہ سُنی۔ آخر کار وہ لوگ اُسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آئے۔ عورت نے حضورؐ سے عرض کیا کہ اسی شخص نے میری عصمت دری کی ہے۔ لوگوں نے بھی کہا کہ ہم نے اس شخص کو بھاگتے ہوئے پکڑا ہے۔ اس شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: مَیں تو در اصل اس عورت کی فریاد سن کر مدد کے لیے آیا تھا اور مجرم کو پکڑنے کے لیے بھاگ رہا تھا کہ ان لوگوں نے راستہ میں مجھے دوڑتے ہوئے پایا اور دھر لائے۔ عورت نے کہا: "جھوٹ کہتا ہے۔ اسی نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔" حضورؐ نے حکم دیا کہ اسے لے جاؤ اور سنگسار کر دو۔ مجمع میں سے ایک شخص نے اٹھ کر کہا: "اس کو سنگسار نہ کرو۔ مجھے سنگسار کرو۔ یہ فعل مجھ سے سرزد ہُوا ہے۔" اب تینوں فریق رسول اللہ کے سامنے موجود تھے: ایک جس نے عصمت دری کی۔ دوسرا، جو عورت کی مدد کے لیے بڑھا تھا اور تیسرا خود عورت۔ آپؐ نے پہلے شخص (اقبالِ جرم کر لینے والے) سے فرمایا: تجھے تو اللہ نے معاف کر دیا۔ دوسرے شخص کے حق میں بھی کلمہ تحسین فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا "یا رسول اللہ! زنا کا اعتراف کر لینے والے کو رجم کی سزا دیجیے"۔ مگر آپؐ نے انکار کیا اور فرمایا: اس نے اللہ سے

توبہ کر لی ہے"

اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد امام ابن قیم نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جرم کے ثبوت یا اعتراف کے بغیر عورت کے مددگار کو کیوں رجم کا حکم جاری فرما دیا تھا۔ امام موصوف نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیصلے کو فوجداری مقدمات میں قرائن اور ظاہری حالات کی شہادت کے اعتبار و استناد کی سب سے بڑی دلیل قرار دیا ہے۔ بلکہ انہوں نے مذکورہ واقعہ کی تمام جزئیات پر قانونی نقطۂ نظر سے بحث کرنے کے بعد ثابت کیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ بالکل درست اور زمانے کے تقاضے پر مبنی ہے۔ اسی ضمن میں امام نے یہ اصول نقل کیا ہے کہ الاحکام الظاہرۃ تابعۃ لادلۃ الظاہرۃ (احکام کا اجراء ظاہری دلائل کے تحت ہوگا) اور آخر میں لکھا ہے۔

"رہا معترف بالزنا سے حد کو ساقط کر دینا تو جب امیر المومنین عمر بن خطاب جیسے شخص کا دامن عفو وسیع نہ ہو سکا تو فقہاء کی کثیر تعداد کے نزدیک اس وسعت کے نہ ہونے کے اور زیادہ امکانات ہیں لیکن رؤف ورحیم ہستی کے دامنِ عفو میں اس کے لیے جگہ تھی، اس لیے اس نے فرما دیا کہ "یہ اللہ سے توبہ کر چکا ہے" اور سزا دینے سے ہاتھ اٹھا لیا۔ یہ نیک اصل مجرم نے برضا و رغبت اعتراف جرم کر کے جس نیکی کا مظاہرہ کیا ہے وہ صرف اللہ ہی کی خشیت سے صادر ہو سکتی ہے۔ اس کا ایک مسلمان آدمی کو موت کے منہ سے بچا لینا، اور اپنی زندگی پر اپنے بھائی کی زندگی کو ترجیح دینا اور اپنی ذات کو خود ہلاکت کے لیے پیش کر دینا یہ اتنی بڑی نیکی ہے کہ اس کے مقابلے میں اس سے سرزد ہونے والا گناہ بالکل ہیچ ہے۔ چنانچہ نیکی کی دوا نے برائی کی بیماری کی مزاحمت کی، مریض کی قوت مدافعت بحال تھی اس لیے مرض زائل ہو گیا اور قلب میں از سر نو صحت آ گئی اور عدالتِ نبوی سے اُسے یہ فیصلہ دے دیا گیا کہ اب ہم سزا نافذ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ کیونکہ سزا تطہیر و علاج ہی کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔ جب تو سزا کے بغیر ہی طاہر تندرست ہو گیا ہے تو ہمارے عفو نے بھی تیرے لیے اپنا دامن وا کر دیا ہے۔ سبحان اللہ!

کونسا فیصلہ اس فیصلہ سے بہتر ہوگا جو رحمدلی سے بھی بھرپور ہے اور حکمت اور مصلحت کے بھی مطابق ہے

قحط سالی میں حد سرقہ کی تنسیخ اور اس کی وجوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قحط کے زمانے میں چور کے ہاتھ کاٹ دینے کی سزا منسوخ کردی تھی اور فرمایا تھا: لاتقطع الایدی فی عذق ولاعام سنۃ (کھجور کی چوری اور قحط سالی میں ہاتھ نہ کاٹے جائیں)۔ السعدی کہتے ہیں میں نے احمد بن حنبل سے دریافت کیا کیا آپ کی بھی یہی رائے ہے؟ فرمایا: "بے شک" میں نے مکرر پوچھا: کیا قحط کے زمانہ میں چوری کی جائے تو آپ ہاتھ نہ کاٹیں گے؟ فرمایا: "نہیں۔ اگر زمانہ خشک سالی کا ہو اور لوگوں پر سختی گذر رہی ایسی حالت میں اگر کوئی شخص حاجت سے مجبور ہو کر چوری کرے تو میں اُسے قطع ید کی سزا نہیں دوں گا"

السعدی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حاطب کے غلاموں کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بھی اس رائے کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حاطب کے غلاموں نے قبیلہ مُزینہ کے ایک شخص کی اونٹنی چرالی مگر گرفتار ہو گئے اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ حضرت عمرؓ کے سامنے انہوں نے چوری کا اعتراف کرلیا۔ آپ نے حاطب کے بیٹے عبدالرحمن کو بلا کر واقعہ کی اطلاع دی اور کثیر بن الصلت کو غلاموں کے ہاتھ کاٹ دینے کا حکم دیا جب وہ غلاموں کو سزا کے لیے لے چلے تو آپ کو فوراً تنبہ ہوا اور انہیں روک دیا اور فرمایا:

"تم لوگ ان غریبوں سے کام لیتے ہو۔ مگران کو بھوکا ماردیتے ہو اور اس حال میں پہنچا دیتے ہو کہ اگران میں سے کوئی حرام چیز بھی کھائے تو اس کے لیے جائز ہوجائے۔ خدا کی قسم اگر میں یہ جانتا ہوتا تو ضروران کے ہاتھ کاٹ دیتا مگر اب ان کے ہاتھ کاٹنے کے بجائے تم پر ایسا تاوان ڈالوں گا کہ تمہارے ہوش ٹھکانے آجائیں گے"

اس کے بعد آپ نے مزنی سے اونٹنی کی قیمت دریافت کی۔ اس نے چار سو درہم بتائی آپ نے غلاموں کے مالکوں کو حکم دیا: اسے آٹھ سو درہم ادا کرو"

امام احمد بن حنبل نے ان دونوں صورتوں میں حضرت عمرؓ کا مسلک اختیار کیا ہے۔ اسماعیل

ابنا سعید ثعالبی کی کتاب المسائل — جس کی شرح السعدی نے "المترجم" کے نام سے کی ہے — میں مذکور ہے کہ السعدی نے امام احمد بن حنبل سے سوال کیا: ایسے شخص کے بارے میں آپ کا کیا فیصلہ ہے جو کسی شخص کے پھل درخت کے اوپر سے چوری کرے؟ امام صاحب نے فرمایا: مالک کو دوگنی قیمت دلوائی جائے گی اور چور کو عبرتناک مار دی جائے گی۔ نیز فرمایا: ہم جس سے حد اور قصاص کو ٹال دیتے ہیں اس پر تاوان دوگنا لگا دیتے ہیں۔ قحط سالی میں حد سرقہ کے سقوط پر امام اوزاعیؒ کی بھی وہی رائے ہے جسے امام احمد بن حنبل نے اختیار کیا ہے۔ یہ رائے سراسر قیاس اور اصول شریعت کے تقاضے پر مبنی ہے۔ کیونکہ جب کال پڑ جاتا ہے اور فقر و فاقہ عام ہو جاتا ہے تو عوام الناس بنیادی ضروریات کے ہاتھوں اتنے مجبور ہو جاتے ہیں کہ چور کے لیے بھی رشتۂ جسم و جان قائم رکھنے کے لیے بنیادی ضروریات کے دباؤ سے محفوظ رہنا ناممکن ہوتا ہے۔ اور ایسے حالات میں خود صاحب مال کا بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ محتاج کی ضرورت کو بالمعاوضہ یا بلا معاوضہ پوری کرے۔ اس بارے میں اگرچہ اختلاف ہے لیکن صحیح قول یہی ہے کہ بلا معاوضہ ضرورت کو پورا کرے اس لیے کہ اسلام نے ہر شخص پر یہ واجب ٹھہرایا ہے کہ وہ دوسرے بھائی کی مواسات کرے، قدرت اور استطاعت ہو تو انسانی جانوں کو بچائے اور ضرورت سے زائد مال کو محتاج پر صرف کرے جب کہ وہ ابتدائی لوازمِ زندگی سے بھی تنگ ہو۔"

علامہ موصوف رحمہ اللہ نے اس موقع پر ان شبہات اور گنجائشوں کو بیان کیا ہے جن کو فقہاء نے حد سرقہ منسوخ کر دینے کے لیے مؤثر و معتبر گردانا ہے۔ اور پھر امام نے پوری قوت کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ قحط سالی اور فقر و فاقہ کے غلبے کا وجود بھی دفع حد کے لیے نہایت قوی شبہ ہے۔ بلکہ ان تمام شبہات و احتمالات سے زیادہ قوی اور قابلِ لحاظ ہے جن کو اربابِ فقہ و قانون تسلیم کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں فرماتے ہیں:

زمانۂ قحط میں حاجتمندوں اور بھوکوں کی کثرت ہوتی ہے اور یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون مستغنی ہے اور بلا وجہ چوری کرنے والا ہے اور کس نے ضرورت سے مجبور ہو کر

چوری کی ہے۔ اور اس سے یہ امر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ کون درحقیقت حد کا مستحق ہے
اور کون نہیں ہے (لہٰذا سب پر سے حد ساقط کر دی جاتی ہے)۔ البتہ جب یہ
صاف واضح ہو جائے کہ چوری کرنے والے کو واقعی اس غلط اقدام کی ضرورت نہ تھی
تو اس کا ہاتھ ضرور کاٹ دیا جائے گا۔"

احکام کی تعمیر میں عُرف و عادت کا لحاظ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر میں کھجور، جو، کشمش اور پنیر کا ایک صاع واجب فرمایا ہے۔ آپ کے زمانہ میں اہلِ مدینہ کی یہی عام غذائیں تھیں۔ لیکن اگر کسی شہر یا بستی کے باشندوں کی غذا ان سے مختلف ہو مثلاً وہ مکی یا چاول یا انجیر یا از قسم اناج کوئی اور چیز کھاتے ہوں تو وہ اُسی میں سے ایک صاع ادا کریں گے۔ بلکہ اگر کسی آبادی کی عام غذا اناج نہ ہو بلکہ دودھ، گوشت، مچھلی وغیرہ ہو تو بہر حال جو غذا بھی ہوگی اُسی میں سے وہ صدقۂ فطر ادا کرنے کے مکلّف ہوں گے۔ جمہور علماء کا یہی مسلک ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔ کیونکہ شارع علیہ السلام کا اصل منشا یہ ہے کہ عید کے روز غرباء اور مساکین بھوکے نہ رہ جائیں اور لوگ جو کچھ خود کھاتے ہوں اُسی سے غریب بھائیوں کی بھی خبر گیری کریں۔ اس لحاظ سے غلّہ کے بجائے آٹا بھی صدقۂ فطر میں دے دینا کافی ہوگا اگرچہ حدیث میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ رہا پکے ہوئے طعام کو صدقہ میں دینا تو اگرچہ ایک لحاظ سے یہ غرباء و مساکین کے لیے زیادہ مفید ہے کیونکہ انہیں پکانے کی زحمت و مشقت نہیں اٹھانا پڑے گی لیکن دوسرے لحاظ سے خشک اناج اُن کے لیے زیادہ کارآمد ہے، کیونکہ ایک تو وہ دیر تک باقی رہ سکتا ہے اور دوسرے اناج سے جو ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں وہ پکے ہوئے طعام سے نہیں کی جا سکتیں۔ بالخصوص جب غرباء کے گھر میں پکا ہوا طعام کثیر مقدار میں جمع ہو جائیگا تو ان کے لیے اسے محفوظ کرنا ناممکن ہوگا اور بیشتر ضائع ہو جائے گا۔ بعض علماء کے نزدیک یہ توجیہ درست نہیں ہے۔ ان کے خیال میں اصل منشا عید کے دن غرباء کو اس حد تک بے نیاز کر دینا ہے کہ وہ اس پر عظمت تہوار میں لوگوں کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: اغنوھم فی ھذا الیوم عن المسألۃ (آج کے دن ان کو سوال سے بے نیاز کر دو)۔ آپ نے غلّہ کو صدقۂ فطر میں

رسائل و مسائل

اسلامی ریاست اور خلافت کے متعلق چند سوالات

[یہ ایک سوالنامہ ہے جو جرمنی سے ایک طالب علم نے اسلامی ریاست اور خلافت کے بعض مسائل کی تحقیق کے لیے بھیجا ہے۔ اصل سوالات انگریزی میں ہیں۔ ذیل میں ہم اُن کا ترجمہ دے رہے ہیں)۔

۱۔ کیا اسلامی ریاست کے سربراہ کے لیے صرف خلیفہ کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے؟

۲۔ کیا اموی خلفا صحیح معنوں میں خلفاء کہلائے جانے کے مستحق ہیں؟

۳۔ خلفائے بنو عباس خصوصاً المامون کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

۴۔ حضرت امام حسنؓ حضرت امام حسینؓ اور ابن زبیرؓ کی سیاسی سرگرمیوں کے متعلق آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟ آپ کی نظر میں ۶۸۰ء میں ملتِ اسلامیہ کا اصل رہنما کون

بقیہ دین میں مصلحت و ضرورت کا لحاظ

ص ۔ دینے کا جو حکم فرمایا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں لوگ عید کے روز خاص طور پر کچھ پکانے کے عادی نہ تھے۔ بلکہ عید کے روز بھی اُن کی وہی غذا ہوتی تھی جو سال کے دوسرے ایام کی ہوتی تھی یہی وجہ ہے کہ عید الاضحیٰ کو چونکہ ان کی غذا معمول کے برعکس گوشت ہوتی تھی اس لیے انہیں حکم دیا گیا کہ اطعموا منا القانع والمعتر (قربانی کے گوشت میں سے کھلاؤ صابر مستحق کو بھی اور بے قرار مستحق کو بھی)۔ چنانچہ اگر کسی شہر یا بستی کے لوگ عید الفطر کے دن خاص طور پر کچھ کھانے پکانے کے خوگر ہوں تو ان کے لیے جائز ہی نہیں لازم ہے کہ وہ انہی کھانوں سے غریبوں اور مسکینوں کی مواسات کریں۔

تھا (حسین یا یزید)؟

۵۔کیا اسلامی ریاست میں خروج ایک نیکی کا کام قرار پا سکتا ہے؟

۶۔اگر خروج کرنے والے مساجد یا دوسرے مقدس مقامات (حرم اور کعبہ) میں پناہ گزیں ہوں تو ایسی صورت میں اسلامی ریاست کا ایسے لوگوں کے ساتھ کیا طرز عمل ہونا چاہیے؟

۷۔وہ ایسے کونسے ٹیکس ہیں جو ایک اسلامی ریاست اپنے شہریوں سے از روئے قرآن و سنت وصول کرنے کی مجاز ہے؟

۸۔کیا کوئی خلیفہ ایسا کام بھی کر سکتا ہے جو سابق خلفاء کے طرزِ عمل سے مختلف ہو؟

۹۔حجاج بن یوسف کو بحیثیت گورنر اور منتظم آپ کیا حیثیت دیتے ہیں؟

۱۰۔کیا اسلامی ریاست اس بات کا استحقاق رکھتی ہے کہ وہ اپنے شہریوں پر ایسے ٹیکس عائد کرے جو نہ تو قرآن و سنت میں مذکور ہوں اور نہ ہی ان کی کوئی نظیر سابق خلفا کے ہاں ملتی ہو؟

جواب: آپ کے ارسال کردہ سوالات کے مفصل جوابات لکھنے کے لیے تو فرصت درکار ہے جو مجھے میسر نہیں۔ البتہ مختصر جوابات حاضر ہیں:

(۱) اسلامی ریاست کے رئیس یا صدر کے لیے "خلیفہ" کا لفظ کوئی لازمی اصطلاح نہیں ہے۔ امیر، امام، سلطان وغیرہ الفاظ بھی حدیث، فقہ، کلام اور اسلامی تاریخ میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ مگر اصولاً جو چیز ضروری ہے وہ یہ کہ ریاست کی بنیاد نظریۂ خلافت پر قائم ہو۔ ایک صحیح اسلامی ریاست نہ تو بادشاہی یا آمریت ہو سکتی ہے اور نہ ایسی جمہوریت جو حاکمیتِ عوام (POPULAR SOVEREIGNTY) کے نظریے پر مبنی ہو۔ اس کے برعکس صرف وہی ریاست حقیقت میں اسلامی ہو سکتی ہے جو خدا کی حاکمیت تسلیم کرے، خدا اور اس کے رسول کی شریعت کو قانونِ برتر اور اولین ماخذ قوانین مانے، اور حدود اللہ کے اندر رہ کر کام کرنے کی پابند ہو۔ اس ریاست میں اقتدار کی اصل غرض خدا کے احکام کا اجرا اور اس کی رضا کے مطابق برائیوں کا استیصال اور بھلائیوں کا ارتقا ہے۔ اس ریاست کا اقتدار، اقتدارِ اعلیٰ نہیں ہے بلکہ خدا کی نیابت و امانت ہے یہی معنی ہیں خلافت کے۔

(۲) اموی فرمانرواؤں کی حکومت حقیقت میں خلافت نہ تھی۔ اگرچہ ان کی حکومت میں قانون اسلام ہی کا تھا لیکن دستور (CONSITUTION) کے بہت سے اسلامی اصولوں کو انہوں نے توڑ دیا تھا۔ نیز ان کی حکومت اپنی طرح میں اسلام کی طرح سے بہت ہٹی ہوئی تھی۔ اس فرق کو ان کی حکومت کے آغاز ہی میں محسوس کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ اس حکومت کے بانی امیر معاویہ کا اپنا قول یہ تھا کہ انا اوّل الملوک (میں سب سے پہلا بادشاہ ہوں)۔ اور جس وقت امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد مقرر کیا اس وقت حضرت ابوبکرؓ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن نے اٹھ کر برملا کہا کہ "یہ تو قیصریت ہے کہ جب قیصر مرا تو اس کا بیٹا قیصر ہو گیا"۔

(۳) اصولی حیثیت سے خلافتِ عباسیہ کی پوزیشن بھی وہی ہے جو خلافت بنی امیہ کی ہے۔ فرق بس اتنا تھا کہ خلفائے بنی امیہ دین کے معاملہ میں بے پروا (INDIFFERENT) تھے اور اس کے برعکس خلفائے بنی عباس نے اپنی مذہبی خلافت اور روحانی ریاست کا سکہ بٹھانے کے لیے دین کے معاملہ میں ایجابی طور پر دلچسپی لی لیکن ان کی یہ دلچسپی اکثر دین کے لیے مضر ہی ثابت ہوئی۔ مثلاً مامون کی دلچسپی نے جو شکل اختیار کی وہ یہ کہ اس نے ایک فلسفیانہ مسئلے کو جو دین کا مسئلہ نہ تھا، خواہ مخواہ دین کا ایک عقیدہ بنایا اور پھر حکومت کی طاقت سے زبردستی اس کو تسلیم کرانے کے لیے ظلم و ستم کیا۔

(۴) جس دور کے متعلق یہ سوال کیا گیا ہے وہ حقیقت میں فتنے کا دور تھا۔ مسلمان اس وقت سخت انتشارِ ذہنی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس وقت عملاً مسلمانوں کا حقیقی لیڈر کون تھا لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ یزید کا سیاسی اثر جو کچھ بھی تھا صرف اس بنا پر تھا کہ اس کے پاس طاقت تھی اور اس کے والد نے ایک مضبوط سلطنت قائم کرنے کے بعد اسے اپنا ولی عہد بنا دیا تھا۔ یہ بات اگر نہ ہوتی اور یزید عام مسلمانوں کی صف میں شامل ہوتا تو شاید وہ آخری شخص ہوتا جس پر لیڈر شپ کے لیے مسلمانوں کی نگاہِ انتخاب پڑ سکتی۔ اس کے برعکس حسین ابن علی رضی اللہ عنہ اس وقت امت کے نمایاں ترین آدمی تھے اور ایک آزادانہ انتخاب میں اغلب یہ ہے کہ سب سے زیادہ ووٹ ان کے حق ہی میں پڑتے۔

(۵) ظالم امراء کے مقابلے میں خروج ایسی صورت میں نہ صرف جائز بلکہ فرض ہو جاتا ہے جبکہ ان کو ہٹا کر ایک صالح و عادل حکومت قائم کرنے کا امکان ہو۔ اس معاملہ میں امام ابو حنیفہ کا مسلک بہت واضح ہے جیسے ابو بکر جصاص نے احکام القرآن میں اور الموفق المکی نے مناقب ابو حنیفہ میں نقل کیا ہے۔ اس کے برعکس ایک حکومت عادلہ کے خلاف خروج بہت بڑا گناہ ہے اور تمام اہل ایمان پر لازم ہے کہ ایسے خروج کو دبا دینے میں حکومت کی تائید کریں۔ بین بین حالت میں، جبکہ حکومت عادل نہ ہو مگر صالح انقلاب کے بھی امکانات واضح نہ ہوں، پوزیشن مشتبہ ہے اور ائمہ و فقہاء نے اس معاملے میں مختلف طرز عمل اختیار کیے ہیں۔ بعض نے صرف کلمہ حق کہنے پر اکتفا کیا مگر خروج کو ناجائز سمجھا۔ بعض نے خروج کیا اور جام شہادت نوش کرنے کو ترجیح دی۔ اور بعض نے بامید اصلاح تعاون بھی کیا۔

(۶) حکومت عادلہ کے مقابلے میں جو لوگ خروج کریں وہ اگر مساجد میں پناہ لیں تو ان کا محاصرہ کیا جا سکتا ہے، اور اگر وہ وہاں سے گولہ باری کریں تو جوابی گولہ باری بھی کی جا سکتی ہے۔ رہا حرم میں ان کا پناہ لینا تو اس صورت میں صرف محاصرہ کر کے اس حد تک تنگ کیا جا سکتا ہے کہ بالآخر باغی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں۔ حرم میں قتل و خون کرنا یا حرم پر سنگ باری یا گولہ باری کرنا درست نہیں ہے بخلاف اس کے ایک ظالم حکومت کا وجود خود گناہ ہے اور اپنے قیام و بقا کے لیے اس کی کوئی کوشش بھی گناہ میں اضافے کے سوا کچھ نہیں۔

(۷) قرآن اور سنت نے ٹیکسوں کا کوئی نظام تجویز نہیں کیا ہے بلکہ مسلمانوں پر زکوٰۃ (بطور عبادت) اور غیر مسلموں پر جزیہ (بطور علامت اطاعت) لازم کرنے کے بعد یہ بات حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دی ہے کہ جیسی ملک کی ضروریات ہوں ان کے مطابق باشندوں پر ٹیکس عائد کریں۔ خراج اور محاصل درآمد و برآمد اس کی ایک مثال ہیں جنہیں قرآن و سنت میں شرعاً مقرر نہیں کیا گیا تھا اور حکومت اسلامی نے اپنی صوابدید کے مطابق انہیں خود مقرر کیا۔ اس معاملہ میں اصل معیار ملک کی حقیقی ضروریات ہیں۔ اگر کوئی فرمانروا اپنے تصرف میں لانے کے لیے ٹیکس وصول کرے تو حرام ہے۔ ملک کی حقیقی ضروریات پر صرف کرنے کے لیے لوگوں کی رضامندی سے ان پر عائد کرے تو حلال ہے۔

(۸) جی ہاں۔ صرف یہی نہیں بلکہ خود اپنے کیے ہوئے سابق فیصلوں کو بھی بدل سکتا ہے۔

(۹) حجاج بن یوسف دنیوی سیاست کے نقطۂ نظر سے بڑا لائق اور دینی نقطۂ نظر سے سخت ظالم حاکم تھا۔

(۱۰) جی ہاں، ان شرائط کے ساتھ جو نمبر ۷ میں بیان ہوئی ہیں۔

مطبوعات

رکن ایمان ترجمہ قرآن پارہ اول یہ قرآن مجید کا ایک نیا ترجمہ ہے جسے مکتبہ نظامیہ ٹکسال لکھنؤ نے فرنگی محل کے مولانا مفتی حافظ ابوالقاسم محمد عتیق صاحب کے قلم سے شائع کرنا شروع کیا ہے۔ غالباً مفتی صاحب پورے قرآن مجید کا ترجمہ مکمل کر چکے ہیں، لیکن فی الحال صرف پہلے پارہ کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے اور وہ اس خیال سے کہ پہلے اس کے متعلق ہند و پاک کے اہل علم اور عوام کی رائے معلوم کر لی جائے پہلے پارہ کے اس ترجمہ کے ساتھ ایک دو ورقہ بھی شائع کیا گیا ہے جس میں اس کے متعلق مولانا عبدالماجد دریا بادی، مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا سید حلیم عطا شاہ شیخ الحدیث ندوۃ العلماء کی آرا تفصیلاً اور بہت سے مشاہیر کی آرا اجمالاً نقل کی گئی ہیں ان تمام حضرات نے اس ترجمہ کو سراہا ہے اور اسے قرآن مجید کے تراجم میں ایک مبارک اضافہ قرار دیا ہے۔ ترجمہ بلاشبہ اچھا ہے اور اس نیا پر اس کے فاضل مترجم مبارک باد کے مستحق ہیں اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جو جمہور امت کے مسلمات کے خلاف پڑتی ہو۔ اس کے علاوہ زبان شگفتہ اور بامحاورہ ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس ترجمہ میں ایک خوبی ایسی ہے جو اسے دوسرے تراجم سے ممتاز کرتی ہے۔ اس میں ہر آیت کا عنوان متعین کر کے اُسے اس آیت کے ساتھ حاشیہ پر درج کر دیا گیا ہے اس سے عام ناظرین کو مطالب قرآنی کے سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

چونکہ فاضل مترجم نے پہلا پارہ اہل علم کی رائے لینے کے لیے شائع کیا ہے اس لیے ہم چند مسامحات کی نشان دہی اس غرض سے کرتے ہیں کہ اس ترجمے کو بہتر بنانے میں کچھ خدمت انجام دینے کی سعادت ہمیں بھی نصیب ہو جائے۔

(۱) "قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ـــــ اس کا ترجمہ "وہ کہتے ہیں کہ ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں" کیا گیا ہے، حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ "ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں" ہے۔ جیسا کہ دوسرے تمام تراجم میں یہی ترجمہ کیا گیا ہے۔

(۲) وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ـــــ اس میں یمدھم کا ترجمہ "قوت دیتا ہے" کیا گیا

حالانکہ اس کے معنی خصوصاً جبکہ اس کے ساتھ فِی بھی استعمال ہوتا ہے، زیادہ کرنے اور بڑھانے کے ہیں

(۳) "فَلَمَّآ اَضَاۗءَتْ مَا حَوْلَہٗ" ـــ اس کا ترجمہ "جب اس کا اردگرد روشن ہو گیا" کیا گیا ہے، حالانکہ موقع و محل کے اعتبار سے اس کا ترجمہ "جب اس نے (یعنی آگ نے) اس کے (یعنی اس شخص کے) اردگرد کو روشن کر دیا" ہونا چاہیے۔

(۴) ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِھِمْ ـــ اس کا ترجمہ "اللہ نے ان کی روشنی لے لی" کیا گیا ہے، حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ "اللہ ان کی روشنی لے گیا" ہے۔

(۵) "وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰہُ لَذَھَبَ بِسَمْعِھِمْ وَاَبْصَارِھِمْ" ـــ اس کا ترجمہ "اگر اللہ چاہے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں (سلب کر) لے جائے" کیا گیا ہے، حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ "اگر اللہ چاہتا تو ۔۔۔ لے جاتا" ہے۔

(۶) وَمَا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ" ـــ اس کا ترجمہ "اور جو تم چھپاتے رہے ہو" کیا گیا ہے حالانکہ اس فقرہ کا سیدھا اور صحیح ترجمہ "اور جو تم چھپا رہے تھے یا چھپاتے تھے" ہے۔

(۷) "وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا" ـــ اس کا ترجمہ "اور میری آیتوں کو تھوڑی سی قیمت کے بدلہ فروخت مت کرو" کیا گیا ہے، حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ "اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑا مول نہ لو" ہے، جیسا کہ شاہ عبدالقادرؒ نے کیا ہے۔

(۸) "فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّھِمْ" ـــ اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے گویا "انہ الحق" مبتدا ہے اور "من ربھم" خبر ہے، حالانکہ اس جملہ میں واضح طور پر "انہ" ابتدا اور "الحق من ربھم" خبر ہے۔

(۹) افتطمعون ان یومنوا لکم" ـــ اس کا ترجمہ "کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہودی) تمہاری خاطر ایمان لے آئیں گے؟" کیا گیا ہے۔ حالانکہ "امن" کے ساتھ "ل" کا استعمال قرآن پاک میں متعدد مقامات پر ہوا ہے اور سب جگہ اس کا مفہوم کسی کی بات پر ایمان لے آنا ہے۔ کسی کی خاطر ایمان لے آنا اس کا مفہوم نہیں ہے۔

(۱۰) "وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ" — میں صرف یسمعون کا ترجمہ کیا گیا ہے، اس کے ساتھ قد کان کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔

ان کے علاوہ کچھ مقامات ایسے بھی ہیں جہاں ترجمہ غلط تو نہیں مگر مرجوح ضرور ہے مثلاً:

(۱) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ — اس کا ترجمہ "ساری تعریفیں" کیا گیا ہے۔ یہ سراسر تکلف ہے کیونکہ یہی مطلب صرف "حمد" یا "تعریف" کہنے سے بھی ادا ہو جاتا ہے

(۲) "صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ" — اس کا ترجمہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے نعمتیں اتاری ہیں، نہ ان لوگوں کا راستہ جن پر غضب کیا گیا اور نہ گمراہوں کا" کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ اگرچہ غلط نہیں ہے اور بہت سے دوسرے بلکہ اکثر تراجم میں یہی ترجمہ کیا گیا ہے، لیکن اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ دو قسم کے لوگوں کا ذکر کر رہا ہے۔ ایک وہ جن پر اس نے انعام کیا اور دوسرے وہ جن پر غضب کیا گیا اور وہ گمراہ ہیں۔ پھر مسلمانوں کو سکھا رہا ہے کہ وہ اس سے پہلی قسم کے لوگوں کی راہ کی ہدایت طلب کریں اور دوسری قسم کے لوگوں کی راہ سے پناہ طلب کریں۔ حالانکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک ہی قسم کے لوگوں کا ذکر کیا ہے اور ایجابی اور سلبی دونوں لحاظ سے ان کی تعریف کی ہے۔ ایجابی لحاظ سے یہ کہ ان پر اس نے انعام کیا اور سلبی لحاظ سے یہ کہ ان پر نہ غضب کیا گیا اور نہ وہ گمراہ ہیں۔ عربی زبان کا معمولی ذوق رکھنے والا آدمی اس فرق کو بآسانی سمجھ سکتا ہے

(۳) "كُنْتُمْ اَمْوَاتًا" کا ترجمہ "تم مردے تھے" کیا گیا ہے حالانکہ اس کا ترجمہ "تم بے جان تھے" زیادہ بہتر ہے

علاوہ ازیں اس ترجمہ قرآن کی کتابت اور طباعت بھی اچھی نہیں ہے بعض مقامات پر تو قرآن مجید کے الفاظ کو پڑھنا مشکل ہو گیا ہے۔ جیسا کہ صفحہ ۲۰ سطر ۱۱ میں "سبحٰنہ" کا لفظ اور صفحہ ۲۴ سطر ۶ میں رب کا لفظ۔ بعض مقامات پر ترجمہ میں بعض ایسے الفاظ رہ گئے ہیں یا اضافہ ہو گئے ہیں کہ ترجمہ کا مفہوم ہی الٹ گیا ہے جیسے "لا ينال عهدى الظلمين" کے ترجمہ "میرا وعدہ ظالموں کو پہنچے گا" میں "پہنچے گا" سے پہلے "نہ" کا رہ جانا۔ اسی طرح "ان الله اصطفىٰ لكم الدين" کے ترجمہ "بلاشبہ اللہ نے تمہارے لیے (یہی) دین پسند نہ فرمایا ہے" میں "نہ" کا اضافہ۔

خالی صفحه

حقوق الزوجین

از

سید ابوالاعلیٰ مودودی

اس کتاب میں اسلامی قانون ازدواج کے مقاصد، ازدواجی زندگی میں زن و مرد کے حقوق و فرائض اور نکاح و طلاق کے مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے ۔

اسلام کے قانون ازدواج کی روح اور اسکے اصول کی وضاحت کرنے کے ساتھ ان احکام کی بھی تشریح کی گئی ہے جو معاملات زن و شوہر کی اصلاح کے لئے قرآن و سنت اور ائمہ سلف کے فیصلوں کے نظائر میں ملتے ہیں ۔ نیز چند ایسی تجویزیں پیش کی گئی ہیں جن سے اصول شرع اسلامی کے مطابق مسلمانوں کے ازدواجی معاملات کی موجودہ الجھنیں دور ہو سکتی ہیں ۔

آخر میں یورپ کے قوانین نکاح و طلاق کو بھی مقابلے کے لئے پیش کیا گیا ہے ۔

ضخامت ۱۹۲ صفحات ۔ قیمت مجلد ۴ روپیہ

ملنے کا پتہ

ادارۂ ترجمان القرآن ۔ اچھرہ ۔ لاہور

مطبوعہ پاکستان پرنٹنگ ورکس ۔ لاہور